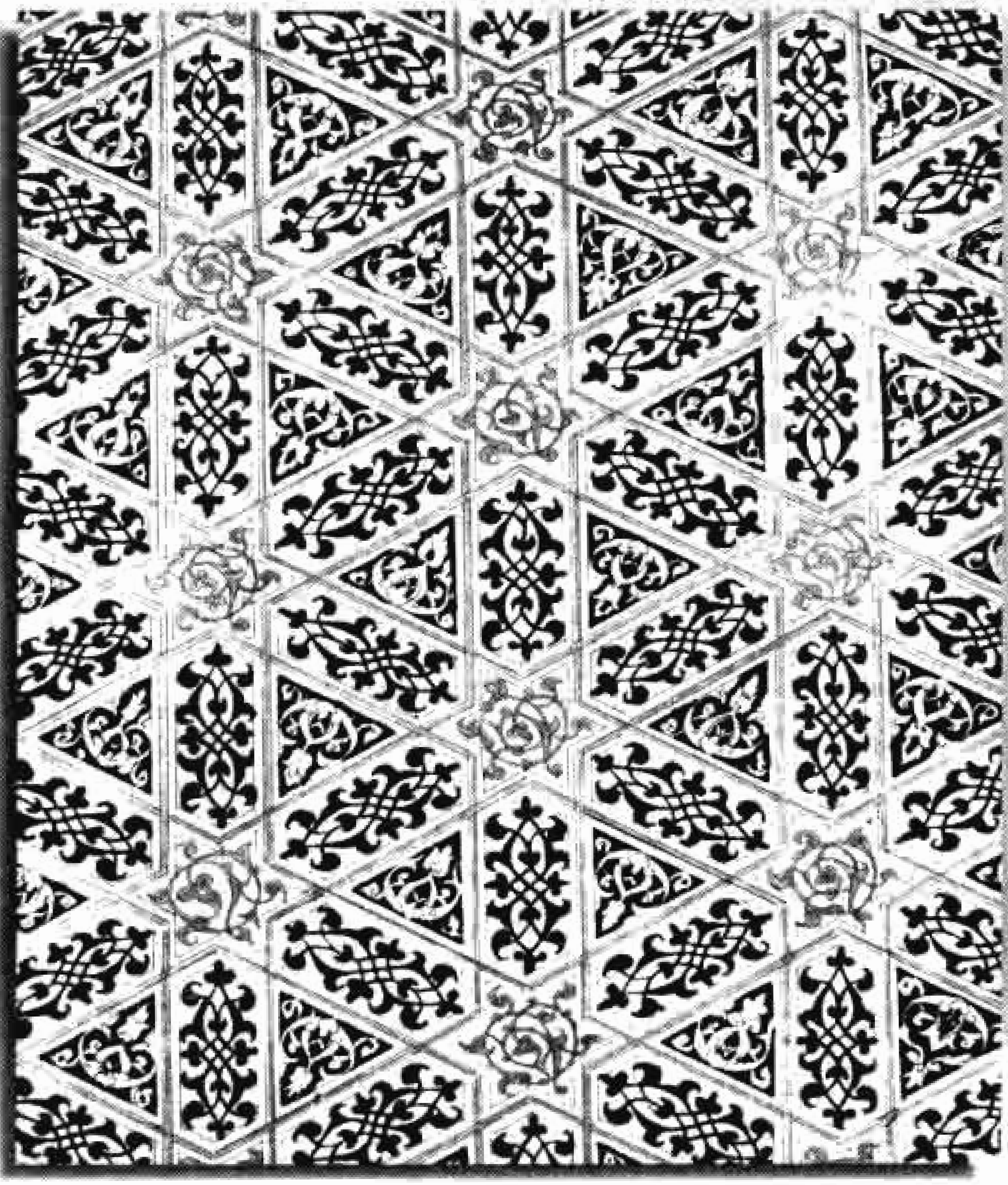
ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱۹۹۸ء

مُدیر
خورشید احمد



اِدارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ ترجمان القرآن

مدیر: خورشید احمد
نائب مدیر: مسلم سجاد

جلد ۳۵ | مئی ۱۹۹۸ء محرم ۱۴۱۹ | عدد ۵

ترتیب

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰
فون: ۷۸۴۳۶۰۵
فیکس: ۷۸۴۳۴۹۳

انتظامی امور

۵ ـ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور
فون: ۷۵۸۷۴۹۶ ـ ۷۵۸۵۵۹۰

☆

قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے
زرسالانہ ۱۵۰ روپے

بھارت ۳۰۰ روپے
بنگلہ دیش، ایران ۳۵۰ روپے
مشرق وسطیٰ، یورپ
مشرق بعید، افریقہ ۶۵۰ روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۹۰۰ روپے

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں۔

"دارالاسلام" کا آغاز

یہ شانِ ایزدی ہے کہ ضلع گورداسپور کے ایک نہایت ہی حقیر گاؤں جمال پور میں' جو پٹھان کوٹ سے تقریباً چار میل جانب جنوب واقع ہے' یہ سعادت چودھری نیاز علی خاں کے حصے میں آتی ہے جو وہاں کا ایک راجپوت زمیندار ہے۔ نہ معلوم اس کے دل میں کیا امنگ اٹھتی ہے اور جذبات کا وہ کون سا طوفان برپا ہوتا ہے جو اس کی روح کو اس درجہ بیدار کرتا ہے کہ وہ اپنی مملوکہ زمین کا ایک اچھا خاصا ٹکڑا اسلام اور قرآن کی دعوت و تبلیغ کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ وہ اس مبارک کام کی تعمیل و تکمیل کے لیے ہر اس شخص سے جویا و مستفسر ہوتا ہے جو اس کے علم و دانست میں اسلام اور اسلامیت کا شیدا اور درد آشنا ہوتا ہے۔ وہ صرف اس پر بس نہیں کرتا بلکہ ان تمام سے مشورہ کر کے ایک ایسی ہستی کا کھوج لگاتا ہے جو معارف قرآن اور اسلامیات کے ابحار [سمندروں] کی شناور ہوتی ہے۔ وہ اس سے اپنا مطلب بیان کرتا ہے اور اس عظیم الشان اور اہم کام کا ذمہ لینے کی تکلیف و دعوت پیش کرتا ہے۔

یہ شخصیت سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ہوتی ہے جو متواتر پانچ سال تک حیدر آباد دکن میں خود بھی اسی گوہر مقصود کے لیے بے تابانہ منتظر ہوتی ہے اور جب وہ مقصود اس کی نگاہوں کے عین سامنے آجاتا ہے تو وہ لبیک لبیک کہہ کر اس کی طرف جھپٹتی ہے۔ وہ چودھری صاحب کی دعوت کو ایک طویل خط و کتابت کے بعد قبول کر لیتی ہے اور جمال پور سے متصل اس سرزمین پر آکر ڈیرے ڈال دیتی ہے جس کا نام کام کی شوکت و پہنائی کے لحاظ سے "دارالاسلام" تجویز ہوا ہے۔

جماعت کی اولین بنیادوں کے لیے مرکز اور داعی دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو بحمد للہ کہ وہ اس طرح پوری ہوئی۔ اب مرکز کے اندر داعی کا سب سے پہلا کام جماعت کی ترتیب و تشکیل کے لیے افراد کا جمع کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس اہم کام کو بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ایک سچے داعی الی الحق کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنی ذات کی طرف نہیں بلکہ اپنے مقصد و منتہی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے بلکہ اپنے سے اعلیٰ اور برتر افراد کا حریص ہوتا ہے اور جب وہ انھیں ایک خاص تعداد میں پا لیتا ہے تو "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" (الحجرات ۴۹:۱۳)' کے معیار و اصول پر وہ اپنی ذات کو چھوڑ کر اپنے دیگر ساتھیوں کو پرکھتا ہے اور اس کا ہر ایک ساتھی بھی اس امر میں اس کی تقلید کرتا ہے۔ (عزیز ہندی' دارالاسلام کا ذہنی پس منظر' ترجمان القرآن' جلد ۱۲' عدد ۳' ربیع الاول ۱۳۵۷ھ' مئی ۱۹۳۸ء)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض؟

بھارت سے دوستی کی بے تابی اور ملت اسلامیہ پاکستان کے حقیقی مفادات

خورشید احمد

دیوار برلن کے گرنے اور روس کی اشتراکی سوپر پاور کے منتشر ہو جانے سے تبدیلی کی جو لہریں رونما ہوئی ہیں وہ ابھی تک بے تاب و مضطرب ہیں اور بناؤ اور بگاڑ کا ایک ہنگامہ خیز عمل برابر رواں دواں ہے اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے۔

قدرت کا قانون ہے کہ ایک دروبست کے بگڑنے سے حالات اس وقت تک متلاطم رہتے ہیں جب تک نیا انتظام وجود میں نہیں آ جاتا۔ دس سال قوموں کی زندگی میں کوئی بڑا عرصہ نہیں لیکن اقتدار اور بالادستی کی نئی جنگ نے ان دس برسوں میں جو گل کھلائے ہیں اور مظلوم انسانیت اس کی جو قیمت ادا کر رہی ہے وہ ہوش ربا ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔ برصغیر اور مشرق اور وسطی ایشیا کی سیاست' معیشت اور ثقافت بھی اس تصادم اور تلاطم کی خصوصی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ سیاسی قوتوں کے نشیب و فراز' عسکری اور سیاسی جنگوں میں فتح و شکست' معیشت کے اتار چڑھاؤ' قیادتوں کی تبدیلی' انقلابات کی آمدورفت' اگر ایک طرف تبدیلی کے اس عمل کی علامتیں ہیں تو دوسری طرف ان میں مستقبل کی تعمیر کے فکرمندوں کے لیے بڑی روشن نشانیاں اور بیش بہا قابل توجہ امکانات اور مواقع ہیں۔ قرآن پاک کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تبدیلی اور تغیر کے اس ظاہری تماشے کے پیچھے ایک عظیم مقصدی عمل بھی جاری و ساری ہوتا ہے جس سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو تاریخ کا رخ بدل سکتا ہے اور اگر ان مواقع کو ضائع کر دیا جائے تو کف افسوس ملنے کے سوا بہت سوں کے مقدر میں کوئی اور چیز نہیں آتی۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۝

(البقرہ ۲:۲۵۱)

اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا، لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے (کہ وہ اس طرح دفع فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے)۔

قوموں کی باہمی عداوت اور دشمنی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہے:

كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (المائدہ ۵: ۶۴)

جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ زمین میں فساد پھیلانے کی سعی کر رہے ہیں مگر اللہ فساد برپا کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (آل عمران ۳:۱۴۰)

یہ تو زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں (تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا) کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) گواہ ہوں۔ کیونکہ اللہ ظالم لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان ارشادات ربانی کی روشنی میں برصغیر میں رونما ہونے والے حالیہ واقعات پر بصیرت کی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ ذاتی رجحانات، عاجلہ مفادات، بیرونی اثرات اور کوتاہ اندیشی پر مبنی مفروضات سے بالا ہو کر ملت اسلامیہ پاکستان کے حقیقی مقاصد اور اہداف کے مطابق فیصلے اور عملی اقدام کیے جا سکیں۔

بھارت میں ہندو انتہا پرستی کا جو رجحان حالیہ انتخابات کے بعد ایک غالب قوت کی صورت میں سامنے آیا ہے حقیقت میں وہ اتنا نیا نہیں ہے۔ اس کی جڑیں بھارت کی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں پیوست ہیں۔ خصوصیت سے پچھلی دو صدیوں میں تو ہندوؤں کی تمام اہم فکری، مذہبی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں میں اس رجحان کو صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ یہی وہ رجحان ہے جس نے سرسید احمد خان سے لے کر قائداعظم محمد علی جناح تک ہر مسلمان رہنما کو "ہندو مسلم اتحاد" کے پرفریب ہدف کو ترک کرنے پر مجبور کیا اور بالآخر توجہ کا مرکز عقیدہ اور تہذیب و ثقافت بنے۔ اس بنیاد پر آزادی کے بعد دو مملکتوں کے قیام کی صورت میں ایک نئے دروبست کو مرتب کیا گیا۔ پچھلے پچاس سال گواہ ہیں کہ امت مسلمہ نے تو کھلے دل سے اس نظام کو تسلیم کیا لیکن بھارت کی ہندو اکثریت اور اس کی سیاسی قیادتوں نے اس کو فی الحقیقت کبھی قبول نہیں کیا۔ اس کے حقیقی عزائم پر ایک عرصے تک ڈپلومیسی اور منافقت کا پردہ پڑا رہا لیکن تابہ کے؟ بالآخر آہستہ آہستہ یہ پردہ

چاک ہو گیا اور ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کی شہادت اور اس کے بعد ۱۹۹۶ اور ۱۹۹۸ کے ملک گیر انتخابات نے اس امر کو اس طرح الم نشرح کر دیا کہ اب دوست اور دشمن سب ہی ہندو انتہا پسندی کے اس غلبے کا اعتراف کر رہے ہیں' بجز خوش فہمی کے ان اسیروں کے جو آنکھیں ہوتے ہوئے بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے!

برصغیر ہی نہیں پوری دنیا میں امن و سلامتی ہر مسلمان بلکہ ہر ہوش مند انسان کی خواہش اور تمنا ہے' لیکن امن و سلامتی محض خواہش سے حاصل نہیں ہوتے۔ اس کے لیے حقائق پر نظر اور مطلوب و مقصود کے حصول کو ممکن ہی نہیں ناگزیر بنا دینے کے لیے موثر حکمت عملی اور ان پر پوری قوت سے عمل ضروری ہے۔ امن اور سلامتی' بزدلی' کمزوری' ڈپلومیسی یا چاپلوسی سے حاصل نہیں ہوتے۔ یہ تو ثمرہ ہیں مقصد اور اہداف پر استقامت' تعمیر و تخلیق کے لیے موثر قوت کے حصول اور اپنی آزادی اور عزت کی حفاظت کے لیے قرار واقعی تیاری اور لام بندی کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے امت مسلمہ کی رہنمائی صاف الفاظ میں صحیح حکمت عملی کی طرف کر دی ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ (الانفال ۸: ۶۰)۔

اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعدا کو خوف زدہ کر دو جنھیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہو گا۔

اور یہی وہ حکمت عملی ہے جس کی شاعر مشرق علامہ اقبال نے بڑے صاف اور دل نشین انداز میں امت مسلمہ کو تعلیم دی۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
ترا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ
یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

نیز فرمایا۔

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات!

ایک صاحب ایمان، حامل شریعت اور باعزت قوم کی خارجہ اور داخلی سیاست مندرجہ بالا بنیادوں سے ہٹ کر کسی دوسری بنیاد پر استوار نہیں ہو سکتی اور نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ہماری سیاسی قیادت جسے پاکستان کی بانی جماعت کی وراثت کا دعویٰ ہے اور ایک بہت بھاری عوامی مینڈیٹ کی کلغی بھی سجائے ہوئے ہے کس طرح بھارت کی ہندو انتہا پسند قیادت سے دوستی کے لیے بے چین اور مضطرب ہے، اس کے بارے میں خوش فہمیوں کا مظاہرہ کر رہی ہے اور امریکہ کی اشیرباد اور جناب اٹل بہاری واجپائی کی "اعتدال پسندی" اور "دوست نوازی" کی ریت پر امن اور دوستی کے محل تعمیر کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے اس پر حیرت ہی نہیں وحشت ہوتی ہے:۔

بتوں سے تجھ کو امیدیں، خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی، اور کافری کیا ہے

اہل پاکستان کے لیے بحیثیت قوم، اس وقت سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ حقائق کا صحیح صحیح ادراک کیا جائے اور خوش فہمیوں اور غیروں پر انحصار کی خیالی دنیا سے نکلا جائے۔ بلاشبہ ہمارے پاؤں زمین پر ہونے چاہییں اور ہمیں چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے چاہییں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ نہ دنیا کے حالات اور مخالفین کی چالوں کا لحاظ ہو اور نہ اپنے مقاصد اور عزائم کا شعور اور ان پر استقامت۔ حالات کی صحیح تفہیم، وسائل کا صحت مند استعمال، قوم کی بیداری اور تعمیر اور مقابلے کے اس عمل میں بھرپور شرکت ہی سے بازی سر کی جا سکتی ہے۔ یہی ہماری بقا اور ترقی کا راستہ ہے۔

۱۔ عالمی سطح پر اس حقیقت کا ادراک بے حد ضروری ہے کہ امریکہ کی ساری کوشش پوری دنیا پر اپنی سیاسی، معاشی، عسکری اور ثقافتی بالادستی اور تسلط قائم کرنا ہے۔ مسئلہ محض دوستی اور تعاون کا نہیں ـــــ دوستی اور تعاون تو سب کے دل کی آواز ہے لیکن اس سے کیسے صرف نظر کیا جائے کہ آج کی واحد سوپر پاور کا منصوبہ محض دوستی کا نہیں بالادستی اور تسلط قائم کرنے کا ہے جس کا اظہار کھلے اور چھپے سابق صدر جارج بش اور ان کی ٹیم سے لے کر صدر کلنٹن اور ان کے مشیروں کے ارشادات سے ہو رہا ہے۔ تازہ ترین

اعلان سی ٹی بی ٹی (CTBT) کے سلسلے میں کلنٹن انتظامیہ کا ہے جس پر لندن کے روزنامہ گارڈین (The Guardian) نے اپنی ۷ اپریل ۱۹۹۸ کی اشاعت میں ادارتی نوٹ کی شکل میں یہ تبصرہ کیا ہے:

لیکن اس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اس معاہدے کے بارے میں بڑے پیمانے پر اضطراب اور بے اعتمادی پائی جاتی ہے اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ سارا کھیل صرف پانچ نیوکلیر ملکوں کی بالادستی اور استیلا کو سند جواز فراہم کرتا ہے۔ کلنٹن انتظامیہ نے تو صاف کہا ہے کہ اس معاہدے کا مقصد دوسرے ممالک کو نیوکلیر ہتھیار حاصل کرنے سے روکنا ہے تاکہ پوری دنیا کے لیے امریکہ کی قیادت واشگاف ہو جائے۔ اسی طرح امریکہ کی قومی سلامتی کونسل کے اسلحے کے ڈائرکٹر رابرٹ بیل نے کہا ہے کہ "معاہدے کا مقصد بم کا خاتمہ نہیں صرف بانگ (Bang) کا خاتمہ ہے (یعنی دوسرے یہ تجربہ نہ کر سکیں)"

۲- علاقائی طور پر دوسروں کو جو طفل تسلی دی جائے' اس سے قطع نظر' امریکہ کا واضح ہدف چین کے گرد حصار تنگ کرنا اور ایشیا میں متبادل عالمی قوتوں کے ابھار کو روکنا ہے' خصوصیت سے چین' جاپان' اور ملت اسلامیہ کے لیے بھارت کو ایک مقابلے کی ایشیائی طاقت بنانا اس منصوبے کا اہم حصہ ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک پاکستان بھارت کی بالادستی کو' کسی نہ کسی عنوان سے' خواہ وہ عنوان علاقائی تعاون اور دوستی ہی کیوں نہ ہو' قبول نہ کر لے۔

۳- علاقائی سطح ہی پر دوسرا ہدف مشرق وسطی میں اسرائیل کو اتنا مضبوط کر دینا ہے کہ وہ پوری عرب دنیا ہی نہیں پوری اسلامی دنیا پر قابو پا سکے--- عسکری اعتبار سے ان پر حاوی ہو اور محض قوت کے بل پر امن کا ڈھونگ رچا کر معاشی اعتبار سے پوری عرب اور اسلامی دنیا کو اس کی گرفت میں لایا جا سکے۔ پھر بھارت اور اسرائیل' جن میں عسکری' سیاسی' معاشی' تحقیقی' جاسوسی غرض ہر سطح پر باہمی گہرا تعاون ہے' مل کر اس پورے علاقے کے نمبردار ہوں اور اس طرح خود اپنے اور امریکہ کے مقاصد کو پورا کر سکیں۔

۴- علاقائی سطح ہی پر اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم ممالک اور عرب ممالک میں کوئی حقیقی اتحاد قائم نہ ہو سکے۔ یہ آپس میں دست و گریباں رہیں اور ان کے وسائل سے دوسرے پورا پورا فائدہ اٹھاتے رہیں تاکہ یہ وسائل خود علاقے کے لوگوں کی خوشحالی اور ایک طاقتور مسلم بلاک کے وجود میں آنے کے لیے استعمال نہ ہو سکیں۔

۵- خود بھارت کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے ایسے حالات کی حوصلہ افزائی ہو کہ ملک گیر سیاسی قوتیں کمزور اور علاقائی جماعتیں مضبوط ہوں تاکہ ان قوتوں کو مختلف انداز میں بطور آلہ کار (leverage) استعمال کیا جا سکے۔ نیز ملک میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کا عمل دخل بڑھے جو مستقبل میں پالیسیوں پر اثرانداز ہو

سکیں۔

۶۔ پاکستان میں ان قوتوں کی حوصلہ افزائی ہو جو ایک طرف پاکستان کی منڈیوں کو امریکی اور یورپی سرمائے اور مصنوعات کے لیے کھول دیں، دفاع کے وسائل کو کم کرنے کے لیے تیار ہوں، نیوکلیر قوت کو مغربی ممالک کے حکم کے مطابق نکیل دینے کے لیے آمادہ ہوں، مغربی ثقافت و تہذیب کے دلدادہ ہوں اور بھارت سے معاشی، ثقافتی اور سیاسی دوستی ہی نہیں، اتحاد اور الحاق تک کے لیے صف بستہ ہو سکیں۔ مسئلہ کشمیر کو نمٹانے (liquidate) کے لیے کوئی اوسلو ٹائپ، یا آئرلینڈ کے ماڈل پر کھیل کھیلا جائے۔ پاکستان کو عرب دنیا، وسط ایشیا اور عالم اسلام سے، جو اس کا فطری مقام ہے، کاٹ کر، بھارت اور جنوبی ایشیا سے جوڑا جائے جس سے کٹ کر یہ ملک وجود میں آیا تھا۔ افغانستان اور ایران سے فاصلے بڑھائے جائیں، جنوبی ایشیا اور سارک کی زنجیروں کو مضبوط کیا جائے اور پاکستان اور چین کی دوستی میں شگاف ڈالا جائے۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان میں آزاد خیالی کے نام پر سیکولرازم اور بھارت سے مشترک ثقافت، تہذیب، ادب اور معیشت کا پرچار ہو، نیز آزادی نسواں (feminism) کی تحریک کو مغربی ثقافتی انداز میں آگے بڑھایا جائے تاکہ خاندان کا حصار پارہ پارہ ہو جائے، نئی نسل کو لسانیت، طبقہ واریت، تشدد، منشیات اور عیش و عشرت کی راہ پر ڈالا جائے، تعلیم اور انسانی وسائل کی ترقی کے نام پر فوج کی تخفیف (down-sizing) ہو (لطف یہ ہے کہ بیرونی قرض اور ان پر ادا کیا جانے والا سود بجٹ کی کل آمدنی کا ۵۰ فی صد کھا جاتا ہے مگر اس کا کوئی ذکر نہیں اور بڑے بڑے ماہرین معاشیات اور سابقہ وزرائے خزانہ جو قرضوں کے اس پہاڑ کا بوجھ مفلس قوم کے کاندھوں پر لادنے کے ذمہ دار رہے ہیں، دفاع پر خرچ ہونے والی رقوم کو، جو ادا کیے جانے والے سود کا اب نصف حصہ ہیں، اصل ہدف بنائے ہوئے ہیں)۔ اس حکمت عملی کا ایک اہم حصہ نیوکلیر قوت سے پاکستان کو محروم کرنا ہے لیکن اس کی سابقہ کوششوں میں ناکامی کے بعد اب ایک نئی حکمت عملی وضع ہوتی نظر آرہی ہے جس کے بارے میں ہمیں خطرہ ہے کہ صدر کلنٹن کی متوقع تشریف آوری کے موقع پر سی ٹی بی ٹی پر کسی نہ کسی شکل میں پاکستان اور شاید بھارت کی بھی شرکت کا اہتمام کیا جائے۔

یہ چھ نکاتی پلان ہے جس پر مغربی اقوام عمل پیرا ہیں۔ اب دیکھیے کہ اس میں بھارت کی حالیہ تبدیلیوں کا کیا مقام ہے اور حکومت پاکستان اس ملک کو کس رخ پر لے جاتا چاہ رہی ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کا قیام بظاہر ۱۹۸۰ میں ہوا اور ۱۸ سال میں وہ سیاسی افق پر تقریباً چھا گئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندو انتہا پسندی کی تحریک انیسویں صدی کے آغاز ہی سے پروان چڑھ رہی ہے۔ ۱۸۲۰ میں پہلی تحریک وجود میں آئی۔ اس طرح کانگریس کے شانہ بہ شانہ ہندو سبھا (۱۹۰۷) اور پھر ہندو مہاسبھا (۱۹۱۸) اپنا

کردار ادا کر رہی تھی۔ راشٹریہ سیوک سنگھ کا قیام ستمبر ۱۹۲۵ میں ہوا اور اس سے پہلے ۱۹۲۳ میں ہندو انتہا پسند رہنما ساورکر (V.D. Savarkar) نے انتہا پسندی کے فلسفہ کو ہندووتا (Hindutva) نامی کتابچے میں پیش کیا جو آج تک اس تحریک کی بائیبل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا حصول خود بی جے پی کا اصل ہدف ہے۔ ساورکر کا یہ کتابچہ رگ ویدا (Rig Veda) پر مبنی ہے اور اس کی رو سے ہندو وہ ہے جس کو پیدائش اور زمین کے مقدس رشتے جوڑے ہوئے ہوں۔ اس نظام میں ہندو اور ہندستان۔ مقدس مادر وطن---- پتروبھو (Pitrubhu) اور پونیابھو (Punyabhu)۔ روح اور جسم کا سا تعلق رکھتے ہیں۔ مقدس زمین کو تین مقدس دریاؤں یعنی دریائے سندھ، گنگا اور برہم پوترا نے گھیرا ہوا ہے۔ ساورکر نے خود ہندو مہاسبھا میں مرکزی کردار ادا کیا۔ اس نے اور ہیگ وار (K.B.Hedg War) نے جو ساورکر کے تصور ہندووتا پر ایمان رکھتا تھا اور ان کا مبلغ بنا، راشٹریہ سیوک سنگھ کی داغ بیل ڈالی۔ ستمبر ۱۹۲۵ میں دسہرے کے ہندو تہوار کے موقع پر جو راون پر کرشنا کی فتح کی علامت ہے، پہلا سیوک (sevak) ناگ پور کے مقام پر قائم ہوا اور پھر تیزی سے یہ نیم عسکری تحریک بڑھتی رہی۔ دو مرتبہ بندش بھی راہ کھوٹی نہ کر سکی اور آہستہ آہستہ راشٹریہ سیوک سنگھ ہندو انتہا پسندی کی ریڑھ کی ہڈی بن گیا۔ آر ایس ایس نے ۱۹۸۹ میں دعویٰ کیا تھا کہ اس کے دائرے میں ۱۸ لاکھ تربیت یافتہ سیوک ہیں جو ۲۵ ہزار شاخوں میں ۱۸۸۰۰ مقامات پر سرگرم عمل ہیں۔ (ملاحظہ ہو رابرٹ ایرک فرائی کن برگ کا مضمون Hindu Fundamentalism and Structural Stability of India جو امریکہ سے شائع ہونے والے فنڈامینٹلزم پروجیکٹ کی تیسری جلد Fundamentalism and the State میں شائع ہوا ہے۔ (یونیورسٹی آف شکاگو پریس، ۱۹۹۳، ص ۲۳۳-۲۴۴)

آر ایس ایس کی اسی تحریک کے بطن سے تقسیم ہند کے بعد ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی کی قیادت میں بھارتیہ جن سنگھ وجود میں آیا۔ یہ نہرو کی مرکزی کابینہ میں وزیر تھے، انھوں نے تقسیم ملک کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ۱۹۵۱ میں لیاقت نہرو معاہدے پر احتجاج کرتے ہوئے کابینہ سے مستعفی ہو گئے تھے۔ اس کی تشکیل میں آر ایس ایس کی پوری قیادت نے مرکزی کردار ادا کیا۔ یہی وہ جن سنگھ ہے جو اٹل بہاری واجپائی کی قیادت میں مرار جی ڈیسائی کے قائم کردہ جنتا دل کا حصہ بنا اور واجپائی صاحب، سنگھ کے دوسرے لیڈر، کے ایل ایڈوانی کے ساتھ مرار جی ڈیسائی کی کابینہ میں شریک ہوئے (کل تین وزیر جن سنگھ کے تھے، اس اسمبلی میں سنگھ کی تعداد ۹۱ بیان کی جاتی ہے)۔ جنتا دل کی حکومت کے دو دور رہے۔ اس کے ناکام ہو جانے پر بھارتیہ جن سنگھ کو ختم کر دیا گیا اور اپریل ۱۹۸۰ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی شکل میں اس کا نیا جنم واقع ہوا جس نے ۱۹۸۴ میں دو اور ۱۹۹۸ میں ۱۷۸ نشستیں مرکزی اسمبلی میں حاصل کیں۔ اس کی متعدد صوبائی حکومتیں

پہلے سے قائم ہیں بشمول یوپی کی حکومت، جس کی قیادت میں بابری مسجد شہید کی گئی اور اب یہ پارٹی مرکزی حکومت کی قیادت کر رہی ہے۔ اس طرح یہ ایک ہی سلسلہ ہے جو کم از کم ۱۹۲۵ سے آج تک جاری ہے۔

اب اس کے فکری اور سیاسی موقف کی بنیادوں پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔ فلسفیانہ سطح پر یہ ہندو تصور کائنات پر مبنی ہے اور نامیاتی وحدت (organic unity) کا قائل ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس کے چار بنیادی اصول اور اہداف ہیں جن کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔

پہلی چیز جو سب سے بنیادی ہے وہ اس کا تصور قومیت و اجتماعیت ہے جسے سلورکر کے خیالات کے خلاصے کے طور پر تحریک کے مفکر گولوالکر (M.S. Golwalkar) نے اپنی کتاب' We, Our Nationhood Defined میں پیش کیا ہے اور جو آج بھی بی جے پی کا منشور اور اس کی حکمت عملی کی روح ہے۔ "ایک ملک' ایک قوم اور ایک کلچر" اس کا مرکزی تصور ہے۔ گولوالکر کہتا ہے:

> ہندستان کے غیر ہندو لوگوں کو ہندو کلچر اور زبان اختیار کرنا چاہیے' ہندو مذہب کا احترام کرنا اور اسے مقدس سمجھنا سیکھنا چاہیے' ہندو نسل اور کلچر کی عظمت کے علاوہ کوئی خیال انھیں نہ آنا چاہیے یعنی انھیں اس زمین اور اس کی قدیم روایات کے لیے نہ صرف اپنا عدم رواداری اور ناشکری کا رویہ ترک کر دینا چاہیے بلکہ اس کے بجائے محبت اور وابستگی کا مثبت رویہ پرورش کرنا چاہیے۔ ایک لفظ میں کہا جائے تو انھیں غیر ملکی نہیں رہنا چاہیے۔ اس ملک میں ہندو قوم کی مکمل ماتحتی میں رہنا چاہیے۔ کسی دعوے کے بغیر' کسی استحقاق کے بغیر کجا یہ کہ کوئی ترجیحی سلوک ہو' حتیٰ کہ شہری حقوق بھی نہیں۔ (مہادیو سوداشر گولوالکر We, Our Nationhood Defined ناگپور' بھارت' پرکاش' ۱۹۳۹' ۱۹۴۷' ص ۵۲-۵۴)

گولوالکر اور اس مکتب فکر کی پوری قیادت مسلمانوں (اور اسی طرح عیسائیوں) کو غیر ملکی (foreigner) قرار دیتی ہے اور ان کے لیے زندہ رہنے کا واحد راستہ اپنے کو ہندوتا کے رنگ میں رنگنے اور اس میں ضم ہو جانے میں قرار دیتی ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی حالیہ فتح پر لندن کے روزنامہ انڈی پینڈنٹ کے نامہ نگار پیٹر پوپہام (Peter Popham) نے بی جے پی اور آر ایس ایس کے ذہن کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

> بی جے پی دوسری پارٹیوں کی طرح پارٹی نہیں ہے۔ یہ ۷۳ سال قبل قائم ہونے والی نیم فوجی تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ کا سیاسی بازو ہے۔ آر ایس ایس اپنی بہت اہمیت سمجھتی ہے۔ برطانوی دور کے آخری عشروں میں اس کا نشوونما ہندوؤں کے لیے وہ کچھ کرنے کی کوشش تھی جو اٹلی اور جرمنی کے لیے مسولینی اور ہٹلر کر رہے تھے: قومی استحکام اور نسل کو خالص رکھنے (purity) کے سنہرے

دور کا آغاز' قوم کے دشمنوں کی شناخت اور انھیں بدنام کر کے قومی استحکام کا حصول' اور جاں نثار نیم فوجی دستوں کے ذریعے ریاست پر قبضہ کرنے کا انتظام۔

آر ایس ایس کی ویب سائٹ (Website) کا اعلان ہے: "ایک وقت تھا کہ ہمارا ملک آزاد اور خوش حال تھا اور زندگی کے ہر میدان میں اعلیٰ مقام تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن چند غیر ملکی حملہ آوروں کے ہاتھوں شکست خوردہ اور بے عزت ہو گیا۔ "مسلم مسئلہ" ہر وقت ذہنوں پر طاری رہا ہے۔ ہندستانی آبادی کی ۱۱ فی صد آبادی کا کیا کیا جائے جن کی وفاداری لارڈ راما سے نہیں' مکہ سے ہے۔ آر ایس ایس کا رہنما گولوالکر جسے اب بھی صرف گرو کہا جاتا ہے' اس بارے میں ہٹلر کے اپنے semitic مسئلے کے لیے رویے سے تحریک حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے: "اپنی قوم اور اس کے کلچر کو خالص رکھنے کے لیے جرمنی نے اپنی پوری آبادی کا صفایا کر کے دنیا کو حیرت زدہ (shocked) کر دیا تھا۔ یہاں قومی افتخار کا اعلیٰ ترین شکل میں اظہار کیا گیا۔ جرمنی کی مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ ان نسلوں اور تہذیبوں کے لیے جن کی اختلافات گہرے ہیں باہم جذب ہونا کتنا ناممکن ہے"۔ آر ایس ایس کے بنیادی عقائد برسوں سے ایک ہی ہیں۔ مسلمان اور دوسری اقلیتیں اب بھی آسیب کی طرح ذہن پر سوار (obsession) ہیں۔ (دی انڈی پنڈنٹ' لندن ۲۲ مارچ' ۱۹۹۸ India's New Rulers Enter With a Whiff of Fascism)

امریکہ کے رسالے ٹائم کا نمائندہ اپنی کتاب' The Indian Unrest میں کہتا ہے:

> گذشتہ ۲۰ برسوں کے ہندو احیا کا پورا کا پورا رجحان مستقلاً مسلمان دشمنی پر مرکوز رہا ہے۔ مسلمانوں کو ہندو مذہب' تہذیب اور ثقافت میں ضم کر کے ان کی عملاً شدھی کرنا ہی ہندووتا کی اصل ہے۔

آر ایس ایس' بھارتیہ جن سنگھ اور خود بھارتیہ جنتا پارٹی کے بنیادی مسلک کا دوسرا نکتہ بھارت کی وحدت کا قیام اور تقسیم ملک پر خط تنسیخ پھیرنے کا پروگرام ہے۔ یہ پروگرام جن سنگھ کے منشور کا پہلا نکتہ ہے یعنی: اکھنڈ بھارت ہمارا سرمایہ حیات ہے (United India is our life blood)۔ البتہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے اسے ذرا گھما پھرا کر بیان کیا ہے۔ پروفیسر ڈی ڈی پاٹانائیک (D.D. Pattanaik) اپنی کتاب Hindu Nationalism in India کی جلد ۳ میں جن سنگھ اور بی جے پی دونوں کے لٹریچر کا جائزہ لینے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دونوں بالآخر تقسیم ملک کو ختم کرنے اور بھارت کی ایکتا قائم کرنے کا ہدف رکھتی ہیں۔ بات صرف پاکستان اور بنگلہ دیش ہی تک محدود نہیں بلکہ تمام ہمسایہ ممالک جو کبھی بھارت کا حصہ تھے وسیع تر ہندستان (Greater India) کا ہدف ہیں۔ گو بی جے پی کے سلسلے میں اتنا اضافہ کرتا ہے:

سیاسی اتحاد قابل عمل نہ ہو' لیکن تہذیبی لحاظ سے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ بی جے پی کے سابق صدر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے یہ بیان کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ پڑوس کے ان ممالک کا رضاکارانہ انضمام ہو سکتا ہے جو ماضی میں ہندستان کا حصہ تھے یعنی پاکستان' بنگلہ دیش' نیپال' بھوٹان' برما اور سری لنکا۔ ("دی اسٹیٹسمین" ۱۹ جنوری ۱۹۹۲ بحوالہ کتاب مذکور' جلد سوم' ص ۱۲۹)

۱۹۹۰ میں بھارتیہ جنتا پارٹی نے جو ایکتا مارچ سومنات سے کشمیر تک کیا تھا' اس کا مقصد بھی اسی ہدف کا اظہار تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت کے بننے کے بعد اس کے سیکرٹری جنرل نے صرف یہی اعلان نہیں کیا کہ ہم پاکستان اور چین سے اپنے علاقے واپس لے لیں گے بلکہ جنوبی ایشیا کے ممالک کی کنفیڈریشن کی تجویز بھی پیش کی ہے۔ تحریک تکمیل پاکستان کے سربراہ محمود علی اور سردار عبدالقیوم نے اس خطرے کا برملا اظہار کیا ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں اکھنڈ بھارت کا قیام برعظیم کی سیاست کا ایک اہم ہدف بنتا جا رہا ہے جسے خود امریکہ کی تائید بھی حاصل ہو رہی ہے اور ملک میں بھی ایک لابی اس کے لیے سرگرم عمل ہے۔ (ملاحظہ ہو نوائے وقت سردار عبدالقیوم خان کا بیان۔ اداریہ اکھنڈ بھارت منصوبے کا انکشاف' یکم مارچ ۱۹۹۸ اور جنگ' راولپنڈی' ۷ مارچ ۱۹۹۸)

بھارتیہ جنتا پارٹی کے تصور ہند اور تصور قومیت اور پاکستان اور پورے علاقے کو ایک بار پھر کسی نوعیت کے اکھنڈ بھارت کی شکل دینا اور دنیا کے اس حصے پر بھارت کی بالادستی قائم کرنا وہ اولیں اور بنیادی مقاصد ہیں جن کے لیے اس تحریک نے گذشتہ ۷۵ سال سے کام کیا ہے اور ناموں اور تنظیموں کی تبدیلی کے باوجود ہدف یہی رہا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ایک طرف علمی' سیاسی اور ثقافتی میدانوں میں کام ہو رہا ہے تو دوسری طرف ایک ایسی عسکری قوت تیار کی جا رہی ہے اور روایتی اور غیر روایتی اسلحہ بندی ہو رہی ہے جس کے بل پر بھارت پورے علاقے کا نگراں بن سکے اور اس طرح صرف علاقائی نہیں کسی درجہ کی عالمی طاقت بن سکے۔

ان کے علاوہ دو مزید اصول بنیادی حیثیت کے حامل بیان کیے گئے ہیں۔ ایک آزاد منڈی پر مبنی سرمایہ دارانہ معیشت کا قیام جو برہمنی ساہوکارانہ تصور معیشت کا نمونہ ہو اور دوسری سودیشی تصور خود کفالت کی ترویج جس کے نتیجے میں بین الاقوامی ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا اثر و رسوخ کم ہو اور بھارتی تجارتی کمپنیوں اور ملٹی نیشنلزم کا فروغ ہو۔

یہ چار بنیادی نکات ہیں جن کے محور کے گرد آر ایس ایس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کی پالیسیاں اور سرگرمیاں گردش کرتی رہی ہیں اور کریں گی۔ حالیہ انتخابی کامیابی کے بعد بی جے پی اور آر ایس ایس کی قیادت نے کھل کر اعلان کیا ہے کہ مکمل اکثریت نہ ہونے کے باعث وہ مشترک ایجنڈے پر ضرور عمل کریں

گے لیکن پارٹی کا اصل ہدف منشور کے مطابق رہے گا اور وہ ایک پچیس سالہ منصوبے پر عمل پیرا ہو گی تاکہ بالآخر مکمل اقتدار حاصل کر کے اپنے حقیقی اہداف حاصل کر سکے۔

مشترک پروگرام کی خاطر بظاہر دستور کی دفعہ ۳۷۰ کو ختم کر کے کشمیر کے مکمل انضمام اور مسلمانوں کے عائلی اور شخصی قانون کو ختم کر کے مشترک سول کوڈ کے منشور میں کیے گئے دعووں کو موخر کیا گیا ہے اور اسی طرح بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کا ذکر اس پروگرام میں نہیں ہے لیکن اگر بھارتی قیادت کے بیانات کا تجزیہ کیا جائے اور خود مشترک ایجنڈے کو دیکھا جائے تو روپ بدل کر ان سب چیزوں کو بھی بین السطور محفوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً دستوری کمیشن کا قیام جو سارے دستور پر پچاس سالہ تجربات کی روشنی میں تجاویز دے گا۔ دفعہ ۳۷۰ اور پرسنل لا کا مسئلہ اس میں آ جاتا ہے۔ رہا بابری مسجد کا مسئلہ تو وزیراعظم واجپائی اور ان کے ساتھیوں نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ: "عدالت اور قانون کا راستہ اختیار نہیں کیا جائے گا اور اس کی جگہ گفت و شنید اور اتفاق رائے سے حل نکالا جائے گا"۔ یہی رویہ ان باقی مساجد کے بارے میں اختیار کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جو اس انتہا پسند قیادت کا ہدف ہیں یعنی متھرا اور کاشی کی مساجد اور مزید دو ہزار مساجد جو اس خونی ایجنڈے کا حصہ ہیں۔

جہاں تک نیوکلیر آپشن اور آزاد کشمیر کو پاکستان سے "آزاد" کرانے کا تعلق ہے تو اسے نئی حکومت کے پروگرام میں کھلے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح چین پر دباؤ اور عالمی طاقت بننا اس ایجنڈے کا حصہ ہے۔

بھارت کی نئی قیادت کے ذہن اور عزائم کے بارے میں کوئی غلط فہمی اور خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ مذاکرات جس سے چاہیں کریں لیکن یہ سمجھ کر کریں کہ کس سے کر رہے ہیں۔ اور اس کے عزائم اور پروگرام کے پورے ادراک اور اپنے مقاصد اور اہداف کے واضح شعور کے ساتھ کریں۔ دوسروں پر بھروسہ کرنے اور توقعات وابستہ کرنے میں ذرا احتیاط سے کام لیں اور خود اپنے ماضی کے تجربات کو نہ بھول جائیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق تو ابھی کل کے واقعات سے ہے جس کی آپ شکایت کرتے ہیں کہ: "گجرال صاحب بڑے اچھے آدمی تھے مگر وعدہ کر کے مکر گئے" اور بھارت کے خارجہ سیکرٹری نے اسلام آباد میں ایک بات کہی اور چند گھنٹے کے بعد دہلی پہنچ کر کچھ اور کہنے لگے۔ یہ صرف ایک دو بار کا معاملہ نہیں۔ پورے پچاس سال سے یہی ہو رہا ہے اور ہم ہیں کہ ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جا رہے ہیں اور مزید کے لیے بھی آمادہ ہیں۔

بھارتیہ جنتا پارٹی اور ہندو انتہا پسندی کے تاریخی کردار اور مختلف جنموں اور رویوں میں اس کے مشترک مقاصد کو سمجھ لینے کے بعد یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کے ۷۲ سالہ وزیراعظم جناب اٹل بہاری واجپائی کے بارے میں صحیح اندازے قائم کیے جائیں اور محض سنی سنائی باتوں پر خیالی قلعے تعمیر نہ

کیے جائیں۔ بلاشبہ ان کے بارے میں یہ روایت ہے کہ "وہ ایک بری پارٹی میں ایک اچھے انسان ہیں" یا یہ کہ وہ معتدل مزاج (moderate) ہیں۔ نیز یہ بھی کہ جب وہ وزیر خارجہ تھے تو پاکستان کی اس وقت کی قیادت ان کی خوش اخلاقی سے متاثر تھی۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہوں گی اور ہمارے پیش نظر ان کی شخصی زندگی کا جائزہ نہیں۔ گو اس بارے میں بھی ہندستان کے اخبارات اور وہاں سے شائع ہونے والی کتب، خصوصیت سے ان کے اپنے پارلیمنٹ اور کابینہ کے ساتھیوں کی یادداشتیں ایسی معلومات سے بھری ہوئی ہیں جن کا جاننا ان سے مذاکرات کرنے والوں کے لیے مفید اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مددگار ہو گا۔

ہمیں سب سے پہلے یہ بات سامنے رکھنی چاہیے کہ ہم بادشاہت کے دور میں سفارت کاری نہیں کر رہے، جہاں حکمران مطلق اختیارات کا حامل ہوتا ہے اور بہت کچھ انحصار اس کی ذاتی پسند و ناپسند پر ہوتا ہے۔ آج کا سیاسی نظام بالکل دوسری بنیادوں پر کام کر رہا ہے۔ بھارت میں ایک کمزور مخلوط حکومت ہے جس کے ہر سانس کا انحصار ایک دو نہیں، ۱۸ سیاسی جماعتوں اور ان کی سیماب صفت قیادتوں اور ان کے نت نئے مفادات پر ہے۔ اگر ۷ ارکان پارلیمنٹ ادھر سے ادھر ہو جائیں تو حکومت زمین پر ہو گی۔ ایسی حکومت سے یہ توقع کہ وہ کوئی بڑا فیصلہ کر سکے گی یا اسے کشمیر جیسے بنیادی مسئلے پر کسی نئے اقدام (initiative) کی ہمت ہو سکتی ہے ایسی خوش فہمی ہے جس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

پھر واجپائی صاحب کی "اصول پرستی" اور "معتدل مزاجی" کے بارے میں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ وہ بچپن سے جن سنگھ کے رکن بلکہ رکن رکین رہے ہیں اور آج بھی اسے اپنی روح اور زندگی قرار دیتے ہیں۔ ان کے وزیر داخلہ انتہا پسندوں میں انتہا پسند، کے ایل ایڈوانی اور ہیومن ریسورس کے وزیر شری مرلی منوہر جوشی، ایڈوانی صاحب سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ داخلہ اور انسانی وسائل کی وزارتیں ان دونوں بااختیار اور متعصب ترین افراد کے پاس ہیں جو اس سے پہلے پارٹی کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ بی جے پی کے ۳۰ وزیروں میں سے ۹ کا انتخاب آر ایس ایس نے کیا ہے اور واجپائی صاحب کی ایک نہ چلی۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ جسونت سنگھ کو وزارت خزانہ دیں لیکن آر ایس ایس کی مخالفت کے ہاتھوں وہ مجبور ہو گئے اور بقول روزنامہ دی ایشین ایج (لندن و دہلی) "وزیراعظم واجپائی، وزیر خزانہ کے انتخاب کے سلسلے میں بالکل تنہا رہ گئے اور ان کے نامزد شخص جسونت سنگھ کو بی جے پی میں سے ایک شخص کی بھی حمایت حاصل نہ ہو سکی"۔ (۲۱-۲۲ مارچ ۱۹۹۸)۔ آر ایس ایس کی ایسی مضبوط گرفت کی موجودگی میں ان کی "اعتدال پسندی" کس کام آ سکتی ہے۔

پھر اس اعتدال پسندی کے ملمع کو بھی زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔ تمام اہم مبصر گواہی دے

رہے ہیں کہ واجپائی صاحب کی حیثیت ایک دکھاوے کی ہے۔ اصل قوت ان کے پاس نہیں، آر ایس ایس کے پاس ہے اور اسی کا حکم چلے گا۔

رہے واجپائی صاحب، تو اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ خود انھیں کئی کئی روپ دھارنے اور موقع محل کے مطابق رنگ بدلنے کا ملکہ حاصل ہے۔ ان کے بارے میں کلدیپ نیر کا مضمون: واجپائی صاحب کے دو چہرے (Two faces of Vajpayee, Dawn, March 28, 1998) اور ایشین ایج کا مضمون: واجپائی صاحب: پردہ کب اترے گا؟ **How long before the mask is off, Mr. Vajpayee?** (The Asian Age, Delhi and London 21 March, 1998) قابل مطالعہ ہیں۔ کلدیپ نیر واجپائی صاحب کے اس مضمون کا خصوصیت سے ذکر کرتا ہے جو My Soul is the RSS کے نام سے واجپائی صاحب نے لکھا تھا۔ اس میں جناب واجپائی نے فرمایا ہے:

"ہم مسلمانوں کا مذہب نہیں بدلیں گے۔ وہ اپنا مذہب اپنائے رہیں۔ مکہ کو وہ ایک مقدس مقام سمجھتے رہیں مگر ان پر لازم ہو گا کہ وہ بھارت کی مقدس ترین حیثیت کو قبول کریں۔ وہ اپنی مسجدوں میں جائیں اور نماز پڑھیں اور روزے رکھیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر ایسا وقت آجائے کہ انھیں اسلام یا مکہ اور بھارت میں سے ایک کو چننا ہو تو بلاتوقف بھارت کو سینے سے لگالیں۔ تمام مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ ہم بھارت کی خاطر زندہ رہیں گے اور بھارت کے لیے جان قربان کریں گے"۔

واجپائی صاحب راشٹریہ سیوک سنگھ کے پروگرام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کے دو پہلو ہیں، اول: ہندوؤں کو منظم کرنا اور دوم: ایک ایسا مضبوط ہندو سماج تعمیر کرنا جو فکری لحاظ سے متحد ہو اور سطحی اختلافات سے بلند ہو کر اپنا پروگرام روبعمل لا سکے۔

کلدیپ نیر صاحب لکھتے ہیں کہ: وہ آر ایس ایس کی پیداوار (product) ہے اور اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ آر ایس ایس اس کے لبرل امیج کو طاقت حاصل کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ کلدیپ نیر آر ایس ایس کے سہ روزہ مشاورتی اجتماع کا بھی ذکر کرتے ہیں جس میں کہا گیا کہ ہم ۲۵ سال میں اپنے اصل اہداف حاصل کر لیں گے۔ آر ایس ایس کے جوائنٹ سیکرٹری موہن داس کا بیان بھی دیا ہے جس نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ نہ ہم رام مندر کی تعمیر سے پیچھے ہٹیں گے اور نہ کاشی اور متھرا کے دعوے سے دست بردار ہوں گے۔ بات صرف اتنی ہے کہ "وقتی طور پر" اس پروگرام کو موخر کیا ہے اور خود واجپائی صاحب اس حکمت عملی میں شریک ہیں۔ وہ پارٹی کا منشور بناتے وقت ایک موقف اختیار کرتے ہیں اور محاذ کے مشترک پروگرام کے وقت دوسرا، ان کا ایک نہیں دو چہرے ہیں۔ گویا:۔

کس کا یقین کیجیے، کس کا نہ کیجیے
لائے ہیں ان کی بزم سے یار، خبر الگ الگ

وزیرخارجہ کی حیثیت سے واجپائی صاحب کے کردار کا بھی بار بار ذکر ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ جناب نواز شریف صاحب نے اپنے تہنیتی خط تک میں اس کا ذکر کر ڈالا ہے۔ لیکن اس بات کو نظرانداز کر دیا گیا ہے کہ وہ اس وقت، وزیراعظم مرار جی ڈیسائی کی کابینہ کے رکن تھے جنھیں بجا طور پر پاکستان کا اعلیٰ ترین سول ایوارڈ دیا گیا تھا۔ مرار جی ڈیسائی ان ہندستانی قائدین میں سے تھے جنھوں نے تقسیم ملک کو دل سے قبول کیا تھا اور ہمیشہ اس کا عملاً احترام کیا۔ انھوں نے روسی حکمران بریژنیوف کی اس دعوت کو برملا رد کر دیا تھا کہ تم پاکستان پر حملہ کرو اور ہم ساتھ دیں گے۔ واجپائی صاحب اس کابینہ کے وزیر تھے جس میں اکثریت ان کے اصل خیالات سے اتفاق نہیں رکھتی تھی لیکن اب وہ اس بی جے پی کی سربراہی میں قائم حکومت کے وزیراعظم ہیں جس کی اصل نکیل آر ایس ایس کے ہاتھ میں ہے۔

اس سلسلے میں کلدیپ نیر کے اس تبصرے کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو مناسب ہو گا جو واجپائی صاحب کی دہری شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ کلدیپ نیر لکھتا ہے:

> جس بات نے اسلام آباد کو ساکت (speechless) کر دیا وہ یہ بات تھی کہ اس نے کہا کہ جو کچھ اس نے ماضی میں کہا ہے اسے بھلا دیا جائے اس لیے کہ اس وقت وہ جن سنگھ کا ممبر تھا اور اب جنتا پارٹی کا حصہ ہے۔ یہ دورہ انتہائی کامیاب رہا۔ کیا واجپائی کا حقیقی چہرہ سامنے آیا؟ یا اس نے حالات کی تبدیلی کے لحاظ سے اداکاری کی؟ ایک ہی وقت میں دو گھوڑوں پر سواری کرتب تو ہو سکتا ہے لیکن یہ حکومت کرنے کا طریقہ نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح واجپائی صاحب کے کردار کا وہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے جو انھوں نے جن سنگھ اور جنتا دل کو ملانے میں انجام دیا اور اس بنیاد پر یہ اتحاد بنا کہ جن سنگھ کا رشتہ آر ایس ایس سے مکمل طور پر منقطع کر دیا جائے گا۔ مشہور ہندستانی لیڈر جے پرکاش نرائن نے بھی اس سلسلے میں کلیدی رول ادا کیا تھا اور بنیادی گفتگو اور معاہدے جے پرکاش نرائن اور اٹل بہاری واجپائی ہی کے درمیان طے پائے تھے۔ لیکن آزمایش کی گھڑی آنے پر واجپائی صاحب کا کردار کیا تھا، کلدیپ نیرہی کے الفاظ میں سنیے:

> یہ گاندھی نواز جے پرکاش نرائن تھا جس نے جن سنگھ پر اپنا پورا اعتماد کیا اور اس کو جنتا کے ساتھ لے آیا۔ جب اس نے آر ایس ایس سے اپنے تعلقات نہیں توڑے تو اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے یہ تک کہا کہ اس کو احساس ہوتا ہے کہ اسے دھوکہ دیا گیا ہے۔ بالآخر اس کلیدی مسئلے پر جن سنگھ کے ممبر جنتا پارٹی سے واک آؤٹ کر گئے۔ واجپائی ان میں سے ایک تھا۔

جنتا پارٹی کے لیڈر سبرامنیم سوامی کی خود نوشت بھارتی اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے کچھ اقتباس دہلی سے شائع ہونے والے ماہنامہ "افکار ملی" (اپریل ۱۹۹۸) میں آئے ہیں جن سے ان کی دوہری بلکہ تہری شخصیت کے متعدد پہلو رونما ہوتے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علاقائی سازشوں میں وہ کب اور کیسا رول ادا کرتے رہے ہیں۔ اندرا گاندھی کی ایمرجنسی کی مخالفت کے باوجود معافی نامہ دے کر رہائی حاصل کرنے سے لے کر مرارجی ڈیسائی، چرن سنگھ اور جگ جیون رام کے ساتھ اقتدار کی جنگ میں کیا کیا کھیل کھیلا گیے۔ یہ تمام باتیں ان کی سیاست کے طریق واردات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ نیز جو بات پاکستان کے لیے جاننا بہت بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہ واجپائی صاحب کا روس کی طرف خصوصی جھکاؤ ہے (اور یہی بات ان کے وزیر دفاع جارج فرنانڈیز کے بارے میں منقول ہے)۔ نیز دونوں کو چین کے بارے میں شدید تحفظات ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ان کو امریکہ کے لیے قابل قبول ہی نہیں بناتی بلکہ مستقبل میں علاقائی سیاست میں ایک خاص رول کی طرف اشارہ کرتی ہے جبکہ چین ہمارا سب سے قابل اعتماد دوست رہا ہے۔ چین سے تعلق کے اس نازک پہلو کو نظرانداز کر کے واجپائی حکومت سے دوستی کی بات کرنا، ایک خطرناک غلطی ہو گی۔

یہ ہے وہ بی جے پی اور اس کے وزیراعظم جناب اٹل بہاری باجپائی جن سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کے لیے ہمارے وزیراعظم اور ان کے ساتھی بے چین و مضطرب ہیں۔ بقول غالب۔

دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

بھارت کے سیاسی تناظر کے اس جائزے کے بعد ایک نظر حکومت پاکستان کے موقف اور اس کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات پر بھی ڈالنا ضروری ہے۔

پہلی بات جو سوچنے سمجھنے والے افراد میں اضطراب پیدا کرنے کا سبب بنی ہے وہ بھارت سے دوستی کا وہ شوق بے پایاں ہے جس کا مظاہرہ وزیراعظم صاحب فروری ۱۹۹۷ میں برسراقتدار آنے کے بعد سے موقع و محل سے بے پروا ہو کر فرما رہے ہیں اور بھارت کی طرف سے ہر تازیانے کے باوجود ان کے اس شوق اور اس کے اظہار میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بھارت کے وزیراعظم، وزیر دفاع اور دوسرے قائدین برابر کہہ رہے ہیں کہ کشمیر پر کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی اور اگر ہو گی تو آزاد کشمیر کو پاکستان سے حاصل کرنے کے سوال پر ہو گی لیکن یہاں سے مذاکرات

مذاکرات کی رٹ برابر لگائی جا رہی ہے۔ بھارت میں کیسی بھی سرکار برسراقتدار ہو، یہاں سے شوق جبہ سائی میں کوئی کمی نہیں، بلکہ اودھر سے جتنا اجتناب اور اعراض و اغماض بڑھے ادھر سے شوق و اضطراب اور چاہت میں اتنا ہی اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر یہ بات قابل ذکر ہے کہ گجرال کے وزیراعظم بننے پر جو خط ہمارے وزیراعظم نے لکھا تھا اس میں کشمیر کے مسئلے کو کلیدی مسئلے (core issue) کے طور پر بیان کیا گیا تھا مگر اب جو خط واجپائی صاحب کو لکھا گیا ہے اس میں کشمیر کا ذکر تو ہے مگر بحیثیت کلیدی مسئلے کے نہیں۔ اس سے آگے بڑھیں تو کلدیپ نیر کو اپنے انٹرویو میں وزیراعظم یہ سندیسہ دیتے نظر آتے ہیں کہ بس کشمیر پر بات کرنے کا اظہار کر دو، بات کرو یا نہ کرو اور کتنی مدت تک بات کیے جاؤ، حاصل کچھ ہو نہ ہو، یہ سب قابل قبول ہے۔ کلدیپ نیر لکھتے ہیں:

> "کشمیر پر مذاکرات شروع ہو جائیں تو نواز حکومت کو اطمینان حاصل ہو گا۔ ان کے ذہن میں کوئی ٹائم فریم نہیں ہے۔ انھوں نے تین ماہ قبل اپنے انٹرویو میں بتایا تھا کہ کشمیر پر بات چیت شروع ہو جائے، اس کے بعد کتنا بھی وقت کیوں نہ لگ جائے میں اس کی پروا نہیں کروں گا۔ ان کی پوزیشن کم و بیش اب بھی وہی ہے۔ لیکن نئی دہلی میں نئی حکومت کے قیام کے بعد بال کو رواں دواں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سے سوال کیا گیا کہ ان کی اس اپروچ سے فوج مطمئن ہو جائے گی تو انھوں نے کہا فوج کی مداخلت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان کی طرف سے مجھ پر کوئی دباؤ نہیں۔ (روزنامہ خبریں، یکم مارچ ۱۹۹۸)

اسی بات کو وزیر خارجہ جناب گوہر ایوب صاحب نے کولمبو میں ہندستان کے اخبار کے نمایندے کو انٹرویو دیتے ہوئے اس طرح بیان فرمایا ہے:

> "کشمیر کا مسئلہ بالآخر (eventually) دونوں ملکوں میں بار بار مذاکرات کا موضوع بنے گا۔ بالآخر پر زور کا مطلب غیر معینہ مدت تک انتظار کے معنوں میں لیا جا سکتا ہے۔ گوہر ایوب نے کہا اگر بھارت کشمیر پر مذاکرات کو بالکلیہ مسترد کرتا ہے تو پھر پاکستان کے لیے مذاکرات جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا"۔ (دی ہندو، ۳ فروری ۱۹۹۸)

اس انٹرویو میں گجرال کے کچھ "نئے خیالات" کا ذکر کیا گیا ہے اور اس پس منظر میں گوہر ایوب صاحب دی ہندو کے نمایندے سے جناب نواز شریف کے واسطے سے وہ بات فرما دیتے ہیں جو پاکستان کے اصولی موقف پر ضرب کاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"Mr. Ayub Khan quoted Mr. Sharif as having told Mr. Gujral further as follows: "If we (India and Pakistan) have to get lawyers to

interpret the very basis of certain agreements to sort the negotiations, where are we going to go? We (Pakistan) are not going to go there. It has to be a will to start the dialogue". (The Hindu, 7 Feb, 98)

گوہر ایوب نے بتایا کہ نواز شریف نے گجرال سے یہ بھی کہا ہے اگر ہم (بھارت اور پاکستان) کو مذاکرات میں آگے بڑھنے کے لیے بعض معاہدوں کی تعبیر کے لیے وکلا کی مدد لینا پڑے' تو ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہم (پاکستان) وہاں نہیں جا رہے۔ مکالمہ شروع کرنے کے لیے ارادے کی ضرورت ہے۔ (دی ہندو' ۷ فروری ۹۸)

ایک طرف کشمیر کے مسئلے کی مرکزی اور اولیں پوزیشن پر سمجھوتہ' دوسری طرف (بھارت سے ۲۰ ارب روپے کے خسارے کی تجارت کے باوجود) تجارتی تعلقات بڑھانے کی بے چینی' سارک کانفرنس کے موقع پر وزیراعظم کا دو سے تین سال میں ان ممالک کے free trade zone پر اتفاق کر لینا' ثقافتی اور تجارتی وفود کی بھرمار' وزیراعظم صاحب کے صاحبزادے کا دورہ بھارت' بسنت جیسے ہندو تہوار کو نہ صرف پاکستان میں رواج دینا بلکہ اس موقع پر بھارت کے ثقافتی طائفے کا استقبال اور بار بار یہ دعویٰ کہ وزیراعظم کو یہ سب کچھ کرنے کا کوئی مینڈیٹ حاصل ہے--- یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو پاکستان اور امت مسلمہ کے مقاصد اور مفادات سے صریح طور پر متصادم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود نوائے وقت' جس نے اس حکومت کی سب سے زیادہ تائید کی ہے' ان سب باتوں پر چیخ پڑا ہے اور اسے کہنا پڑا ہے کہ اس خطرناک کھیل کو لگام لگنی چاہیے۔ (ملاحظہ ہو صرف ایک مہینے میں آٹھ اداریے' یکم مارچ' ۳ مارچ' ۵ مارچ' ۶ مارچ' ۲۰ مارچ' ۲۷ مارچ' ۳۰ مارچ' ۳۱ مارچ)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان کا رویہ ژولیدہ فکری' سمجھوتہ کاری اور اصولی موقف سے فرار کی راہیں تلاش کرنے کا غماز ہے۔ نہ قوم نے کسی حکمران کو اس انحراف بلکہ غداری کا مینڈیٹ دیا ہے اور نہ وہ اسے کسی قیمت پر برداشت کرے گی۔ یہ سلسلہ فوری طور پر ختم ہونا چاہیے۔ ورنہ ملک کو شدید اندرونی اور بیرونی انتشار سے بچانا مشکل ہو جائے گا۔

حکومت نے ایک اور مہا غلطی (Himalyan Blunder) کیمیکل ہتھیاروں کے معاہدے (Chemical Weapons Convention CWC) کی ضروری تحفظات کے بغیر توثیق کر کے کی ہے۔ یہ معاہدہ دراصل ساری دنیا پر مغربی اقوام کے تسلط کو قائم کرنے کے منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ نیوکلیر سدجارحیت (deterrent) کی طرح کیمیکل ہتھیار بھی ایک نوعیت کے سدجارحیت کا رول ادا کرتے ہیں۔ محض اس لیے کہ بھارت اس پر تیار ہو گیا ہے اسے قبول کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ نیوکلیر اسلحہ کی طرح جس کے پاس کیمیاوی ہتھیار ہیں' پہلے وہ ان کو ضائع کرے نہ کہ دوسروں کے ہاتھ پاؤں

پابند ہے۔ پھر بھارت نے حسب عادت دھوکے سے کام لیا۔ پہلے کہا کہ ہمارے پاس کوئی کیمیاوی ہتھیار نہیں ہے لیکن عین توثیق کے وقت کیمیاوی مواد کی موجودگی کا اعتراف کر کے اس کو بچا لینے کی کوشش کی۔ پھر اس کی کوئی کوشش نہیں کی گئی کہ جس طرح امریکہ CWC کے معاملہ میں پیش پیش ہونے کے ساتھ اپنے ملکی قانون کے ذریعے دو معاملات میں تحفظات حاصل کر رہا ہے یعنی معائنے کی جگہوں کے سلسلے میں امریکی صدر کے انکار کا اختیار اور معائنہ کرنے والے ممالک کے بارے میں رد و اختیار کا حق--- ہم بھی یہ اختیار حاصل کریں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جو تحفظات امریکہ اپنے لیے حاصل کر رہا ہے ان سے دوسرے ممالک کو محروم رکھا جائے۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ پچھلے کئی سالوں سے معائنے کے حق کو بارہا غلط طور پر مداخلت اور تنگ کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ آج عراق میں یہی ہو رہا ہے اور کل دوسرے ممالک بھی اس کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ بھارت اور اسرائیل یہ کھیل کھیل سکتے ہیں اور معاہدے کے آرٹیکل IV' VI اور Verification Annex میں وہ سارے اختیارات موجود ہیں جن کو فتنہ جو غلط طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ ان کے خلاف تحفظ کم از کم ملکی قانون کی شکل میں ضروری تھا اور ہے۔

غوری میزائل کا تجربہ ایک بروقت اور قابل قدر اقدام ہے جس کی تحسین ہونی چاہیے۔ اس سے نیوکلیر سدجارحیت کو مکمل اور مزید مستحکم کیا جا سکتا ہے۔ یہ وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے لیکن اس خطرے سے پوری طرح آگاہ رہنے کی ضرورت ہے کہ امریکہ کی طرف سے نرم ردعمل کی قیمت سی ٹی بی ٹی پر دستخط کی شکل میں ادا کرانے کی ہر سازش کا بروقت توڑ کیا جائے۔

امریکہ اس پس منظر میں بھارت کو سی ٹی بی ٹی کی مشروط قبولیت کے لیے تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اسے یہ دلاسہ دیا جا رہا ہے کہ تم عملاً تو نیوکلیر پاور ہو' ۸۰ سے ۱۰۰ بم تم بنانے کی پوزیشن میں ہو اور بھارتی سائنس دانوں کے حالیہ دعووں کی روشنی میں ایک ہزار بم تک بنانے کا خام مواد موجود ہے۔ ان حالات میں امریکہ بھارت کو غیر سرکاری طور پر نیوکلیر پاور مان لے گا اور باقی ساری مراعات دے گا اگر وہ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کر دے۔ اگر بھارت آمادہ ہو جاتا ہے تو پھر سارا دباؤ پاکستان پر ہو گا کہ اپنے وعدے کے مطابق دستخط کرو اور اپنی سہولتوں کو معائنے کے لیے کھولو' اس کی پیش بندی کی فوری ضرورت ہے۔ اس کا راستہ یہ ہے کہ ایک طرف میزائل پر تحقیق اور عملاً میزائل کو دفاعی نظام کا حصہ بنانے (Induction) کو آگے بڑھایا جائے اور دوسری طرف اتنی نیوکلیر استعداد پیدا کر لی جائے کہ کم از کم آیندہ بیس پچیس سال کے لیے بھارت کی حد تک مقابلے کا deterrent موجود رہے۔

اس وقت پاکستان کی اصل ضرورت بھارت سے مذاکرات یا تجارت نہیں بلکہ اپنے گھر کی اصلاح اور نظریاتی' اخلاقی' معاشی' معاشرتی اور عسکری اعتبار سے ملک و قوم کو مستحکم کرنا ہے۔ نظریاتی انتشار کو ختم کرنے اور قومی مقاصد کے بارے میں یکسوئی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ امن و امان کی صورت حال کی

اصلاح اور سرحدوں کی حفاظت صرف فوجی کارروائیوں کے سلسلے ہی میں نہیں بلکہ تخریب کاری اور سمگلنگ کے سدباب کے لیے بھی ضروری ہے۔ فوج کی تخفیف نہیں اس کی optimal rationalisation اور بہتر قوت کار (readiness) کا اہتمام کیا جائے۔ ایرفورس اور نیوی میں جو نسبتاً کمزوری (relative weakness) پیدا ہو چکی ہے' اس کا تدارک ہو۔ بیرونی قرضوں کے ری شیڈولنگ کے لیے کوئی پیکج فوری طور پر تیار کیا جائے تاکہ وسائل' دفاع اور انسانی اور معاشی ترقی کے لیے فراہم ہو سکیں۔

بھارت سے صاف لفظوں میں کہہ دیا جائے کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں ہمارا اولیں اور اصل مسئلہ ہے۔ اگر اس مسئلے پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیری عوام کی مرضی معلوم کرنے کے نظام کار پر بھارت بات چیت کے لیے تیار ہے تو چشم ما روشن دل ماشاد' ورنہ بھارت سے کسی نوعیت کے مذاکرات اور تجارتی اور ثقافتی تعلقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ بھارت کے تجارتی بائیکاٹ کا آغاز خود اپنے ملک سے کیا جائے اور پوری دنیا کو اس کی دعوت دی جائے جیسا کہ او آئی سی کی کراچی اور کیسابلانکا قراردادوں میں کہا گیا ہے۔ ثقافتی تعلقات' کھیل میں تعاون اور اسی نوعیت کے دوسرے نام نہاد اعتماد بنانے والے اقدامات صرف ایک دھوکہ ہیں اور ہمیں صاف کہہ دینا چاہیے کہ کشمیر میں مظالم اور حق استصواب سے محرومی کی صورت میں ان میں شرکت ایک باغیرت قوم کے لیے ممکن نہیں۔ قومی سلامتی اور دفاع کی مضبوطی کے لیے ہمہ گیر اقدامات کیے جائیں اور ملک میں عسکری' معاشی اور ثقافتی میدانوں میں خود انحصاری (self-reliance) کو اولیں اہمیت دی جائے۔ اس سے ہماری گفت و شنید کی استعداد اور قوت میں بھی اضافہ ہو گا اور ملک خود کفالت اور خوش حالی کی طرف بڑھ سکے گا۔

بھارت میں ہندو انتہا پرستی کے غلبے سے جو چیلنج خود بھارت کے لیے اور اس کے مسلمانوں کے لیے رونما ہوا ہے اور جو مسائل اور خطرات پاکستان اور دوسرے ہمسایہ ممالک کے لیے پیدا ہوئے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کرنے' ان کے مقابلے کے لیے صحیح منصوبہ بندی کرنے' ان کے سلسلے میں علاقائی اور عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنے اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے حقیقت پسندانہ اقدامات کرنا وقت کی اصل ضرورت ہے۔ اس پورے عمل میں قوم کو اعتماد میں لینا اور اسے ہر مقابلے کے لیے تیار کرنا بھی ازبس ضروری ہے۔ ان حالات میں بھارت سے دوستی کے خواب دیکھنا اور اس سراب میں پانی تلاش کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔ اس کی مثال اس شترمرغ کی ہے جو خطرے کا مقابلہ کرنے کی بجائے ریت میں سر چھپا لیتا ہے۔ مردوں کا کام مقابلے کی تیاری ہے اور یہ جان کر تیاری کرنا ہے کہ کس قسم کے مدمقابل سے سابقہ ہے۔ چیتا اپنی اصلیت کبھی نہیں بدلتا اور محض بھیڑ کی کھال اوڑھ لینے سے بھیڑیا بھیڑ نہیں بن جاتا۔ دوست دشمن میں تمیز اور دشمن سے مقابلے کی قوت پیدا کر کے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ہی زندہ قوموں کا شعار ہے۔

اللہ کی راہ میں انفاق کرنے والو!
جب تم کسی کو دیتے ہو اپنے پاس سے نہیں دیتے
جسے دیتے ہو اسے اس کا حق پہنچاتے ہو

جس نے تم کو دیا ہے اس کے خزانے بے پایاں ہیں
جو اللہ کی راہ میں دیتے ہیں
انھیں دینے کے لیے اُن کے پاس کمی نہیں
دس گنا، سو گنا، سات سو گنا ....

دیتے ہوئے کبھی خیال نہ کرو کہ
تمھارے پاس کمی ہو جائے گی

یہ دینا بڑھاتا ہے
کم نہیں کرتا۔

(محدودخدا)

حُرّیتِ فکر کے احیا کی ضرورت

سرکار رسالت مآبؐ نے جس حریت فکر کی تخم ریزی کی تھی' اور احکام الٰہی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسان کے مقابلے میں آزادی رائے استعمال کرنے کا جو سبق اپنے متبعین کو خود اپنے عمل اور اپنے برتاؤ سے سکھلایا تھا' اسی کا یہ اثر تھا کہ صحابہ کرامؓ تمام انسانوں سے زیادہ احکام الٰہی کے اطاعت کیش' اور تمام انسانوں سے زیادہ آزاد خیال و جمہوریت پسند تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شخص کے مقابلے میں بھی اپنی رائے کی آزادی کو قربان نہ کرتے تھے۔ ان کی ذہنیت سے یہ بات بالکل بعید تھی کہ کسی رائے کو محض اس بنا پر تنقید سے بالاتر سمجھیں کہ وہ فلاں بڑے آدمی کی رائے ہے۔ ان میں جو بڑے آدمی تھے' جن کی بڑائی کو وہ خود تسلیم کرتے تھے اور جن کی بڑائی آج ایک دنیا تسلیم کر رہی ہے' ان کی رائے کو بھی انھوں نے محض ان کی بڑائی کی بنا پر قبول نہ کیا بلکہ آزادی کے ساتھ رد بھی کیا اور قبول بھی کیا۔ خلفاے راشدین' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ اس آزادی رائے کے حامی تھے۔ انھوں نے اپنے آقا کی پیروی میں اس کو نہ صرف گوارا کیا' بلکہ اس کی ہمت افزائی کی' اور کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی یہ مطالبہ نہ کیا کہ ہم بڑے آدمی ہیں' اس لیے ہماری بات کو بے چون و چرا تسلیم کرو۔

خلفاے راشدین کے بعد بنی امیہ اور بنی عباس نے اس حریت فکر کو تخویف اور اطماع [ڈرا دھمکا کر اور لالچ کے ذریعے] ظلم و ستم اور زرپاشی کی طاقتوں سے ہر طرح کچلنے کی کوشش کی مگر تابعین اور تبع تابعین اور ان کے بعد بھی ایک مدت تک یہ روح مسلمانوں میں باقی رہی۔ ابتدائی دو تین صدیوں تک آپ کو تاریخ اسلامی میں اس کے نہایت روشن نشانات نظر آئیں گے۔ امرا اور حکام کے مقابلے میں آزادی تو نسبتاً ایک چھوٹی چیز ہے۔ روح اور دماغ کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان جس کو مقدس سمجھے' جس کی عزت و عظمت اس کے پہنائے قلب میں جاگزیں ہو' اس کی بھی اندھی تقلید سے انکار کر دے' اور اس کے مقابلے میں بھی آزادی کے ساتھ سوچے اور آزادی کے ساتھ رائے قائم کرے۔ یہی اسپرٹ ہم کو اس دور کے اہل علم میں نظر آتی ہے۔ صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر مقدس ہستیاں اور کون ہوں گی اور حضرات تابعین سے بڑھ کر کس کے دل میں ان کا احترام ہو گا مگر یہ لوگ آزادی کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی آرا پر نقد کرتے تھے' ان کے اختلافات میں محاکمہ کرتے تھے اور ایک کی رائے کو چھوڑ کر دوسرے کی رائے کو قبول کرتے

تھے۔ اختلاف صحابہ میں امام مالکؒ کس صفائی کے ساتھ فرماتے ہیں: خطا وصواب فانظر فی ذالک، "ان کی آرا میں خطا بھی ہے اور صواب بھی۔ تم خود غور کر کے رائے قائم کرو"۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے: احد القولین خطا والماثم فیہ موضوع، "دو مختلف اقوال میں سے ایک بہرحال غلط ہو گا"۔

خود ان بزرگوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم خطا سے بری ہیں اور تم اپنی فکر و نظر کو بالکل معطل کر کے صرف ہماری رائے کی پیروی کرو۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ جب کسی مسئلے میں اپنی رائے سے کچھ فرماتے تو ساتھ ہی یہ بھی فرما دیتے: ھذا رایی فان یکن صواباً فمن اللہ وان یکن خطاً فمنی واستغفر اللہ، "یہ میری رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اگر غلط ہے تو میری خطا ہے اور میں خدا سے مغفرت چاہتا ہوں"۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: لا تجعلوا خطا الرای سنۃ للامۃ، "رائے کی غلطی کو امت کے لیے سنت نہ بنالو"۔

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے: الا لا یقلدن احدکم دینہ رجلا ان امن امن وان کفر کفر فانہ لا اسوۃ فی الشر، "خبردار کوئی شخص اپنے دین کے معاملے میں کسی دوسرے شخص کی اندھی تقلید نہ کرے کہ وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن رہا اور وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہو گیا۔ برائی اور غلطی میں کسی کی پیروی نہیں ہے"۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: انما انا بشر اخطی واصیب فانظر وافی رائی فکلما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ وکلما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ، "میں ایک انسان ہوں۔ میری رائے غلط بھی ہوتی ہے اور درست بھی۔ تم میری رائے میں نظر کرو۔ جو کچھ کتاب و سنت کے موافق پاؤ، اسے قبول کرو اور جو بات خلاف دیکھو، اسے چھوڑ دو"۔ امام مالکؒ ہی کا یہ واقعہ تاریخوں میں موجود ہے کہ خلیفہ منصور عباسی ان کی کتاب، الموطا کو تمام عالم اسلامی کا دستور العمل بنانا چاہتا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ تمام مذاہب فقیہ کو موقوف کر کے صرف مذہب مالکی کو رائج کر دے۔ مگر امام صاحب نے خود اس کو ایسا کرنے سے روک دیا کیونکہ وہ دوسروں سے تحقیق اور آزادی رائے اور اجتہاد کا حق سلب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: لا یحل لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا، "کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول کا قائل ہو تاوقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے"۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: مثل الذی یطلب العلم بلاحجۃ کمثل حاطب لیل یحمل حزمۃ حطب وفیہ افعی تلدغہ وھو لا یدری، "جو شخص حجت کے بغیر علم حاصل کرتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو رات کو لکڑیاں چن رہا ہے، وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھاتا ہے اور اس کو خبر نہیں کہ اس گٹھے میں کہیں سانپ بھی

چھپا ہوا ہے جو اس کو ڈس لے گا"۔

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حریت فکر و نظر اور آزادانہ طلب حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد امرا و حکام اور علما و مشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا شروع کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھنے کا حق اور بولنے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا' درباروں سے لے کر مدرسوں اور خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی۔ دل اور دماغ کی غلامی' فکر اور نظر کی غلامی' روح اور جسم کی غلامی' ان پر پوری طرح مسلط ہو گئی۔ دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کرا کے غلامانہ ذہنیت پیدا کی۔ مدرسے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر دماغوں میں اتارا۔ خانقاہ والوں نے "بیعت" کے مسنون طریقے کو مسخ کر کے مقدس غلامی کا وہ طوق مسلمانوں کی گردنوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور بھاری طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایجاد نہ کیا ہو گا۔ جب غیراللہ کے سامنے تابہ زمیں سر جھکنے لگیں' جب غیراللہ کے آگے نماز کی طرح ہاتھ باندھے جانے لگیں' جب انسان کے سامنے نظر اٹھانا بھی سوء ادب ہو جائے' جب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چومے جانے لگیں' جب انسان' انسان کا خداوند اور مالک اور ان داتا بن جائے' جب انسان بذات خود امر و نہی کا مختار اور کتاب اللہ و سنت رسولؐ کے استناد [سند] سے بری قرار دیا جائے' جب انسان خطا سے پاک اور نقص سے بری اور عیب سے منزہ سمجھ لیا جائے' جب انسان کا حکم اور اس کی رائے اعتقاداً نہ سہی' عملاً اسی طرح واجب الاطاعت قرار دے لی جائے' جس طرح خدا کا حکم واجب الاطاعت ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس دعوت سے منہ موڑ لیے گئے جو' اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ [(آل عمران ۳:۶۴)' "یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں' اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے"] کے ساتھ دی گئی تھی۔ اس کے بعد کوئی علمی' اخلاقی' روحانی ترقی ممکن ہی نہیں۔ پستی اور زوال اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ (اشارات' ترجمان القرآن' جلد ۹' عدد ۳' ص ۱۷۲-۱۷۵)

وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ

(المائدہ : ۱۰۰)

ظاہر بیں نظر میں سو روپے بمقابلہ پانچ روپے کے لازماً زیادہ قیمتی ہیں
کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ'

لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ

سو روپے اگر خدا کی نافرمانی کر کے حاصل کیے گئے ہوں تو وہ ناپاک ہیں'
اور پانچ روپے اگر خدا کی فرماں برداری کرتے ہوئے کمائے گئے ہوں تو
وہ پاک ہیں'
اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو'
بہر حال وہ پاک کے برابر کسی طرح نہیں ہو سکتا'
غلاظت کے ایک ڈھیر سے عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے'
اور پیشاب کی ایک لبریز ناند کے مقابلے میں پاک پانی کا ایک چلو زیادہ وزنی
ہے'
لہٰذا ایک سچے دانش مند انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کرنی
چاہیے'
خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر و قلیل ہو'
اور حرام کی طرف کسی حال میں بھی ہاتھ نہ بڑھانا چاہیے'
خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر و شاندار ہو۔

(تفہیم القرآن' ج ۱' ص ۵۰۰)

(خیر خواہ)

نرم خوئی

مولانا عبدالمالک۔ مسلم سجاد

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جسے نرم خوئی سے حصہ دیا گیا' اسے دنیا اور آخرت کی بھلائیوں سے حصہ دے دیا گیا اور جسے نرم خوئی سے محروم کیا گیا' اسے دنیا اور آخرت کی بھلائیوں سے محروم کر دیا گیا۔ صلہ رحمی' حسن اخلاق' اچھا پڑوس ملکوں کو آباد کرتے ہیں اور عمروں میں اضافہ کرتے ہیں۔ (مسند احمد)

نرم خوئی میں پوری شخصیت کا اظہار ہے۔ گفتگو میں نرمی' الفاظ میں نرمی' لہجے میں نرمی' برتاؤ میں نرمی' لین دین میں نرمی' جس کا یہ طریقہ ہو' اسے دل کا اطمینان اور سکون میسر ہوتا ہے' زندگی چین سے بسر ہوتی ہے اور آخرت کے انعامات میں حصہ بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ کرخت آواز میں بات کرنے والا' درشت لہجہ اختیار کرنے والا' بات بات پر آپے سے باہر ہونے والا' لین دین میں سختی کرنے والا' خود اپنی زندگی بھی تکلیف سے گزارتا ہے اور اپنے آس پاس ساتھ رہنے والوں کو بھی اذیت دیتا ہے۔ یقیناً دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کی بہت سی بھلائیوں سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔

جو دعوت دین کا کام کرتے ہیں' انھیں شعوری طور پر نرم روی اختیار کرنا چاہیے اور اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ اگر رسول اللہؐ بھی دل کے سخت ہوتے تو لوگ ان کے گرد جمع نہ ہوتے۔

نرم خو افراد اچھے پڑوسی ہوتے ہیں' اخلاق کے اچھے ہوتے ہیں' دکھ درد میں شرکت کرنے والے ہوتے ہیں۔ لوگ ایسے ہوں تو معاشرتی زندگی میں سکون ہو گا' وقت اچھا گزرے گا۔

○

حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

پاکیزگی میں کیسے اعلیٰ مقام عطا کرے گا اللہ تعالیٰ اس قوم کو' جو اپنے معاشرے کے کمزور کو اپنے طاقت ور سے حق نہیں دلا سکتی۔ (طبرانی)

ایک ایسا نظام جہاں کوئی کسی کا حق نہ مارے' اسی صورت میں تشکیل پا سکتا ہے کہ طاقت ور کو معلوم ہو کہ وہ

اپنے اثر و رسوخ، دولت اور مقام کی وجہ سے کسی کمزور کا حق نہیں دبا سکتا۔ یہ بات محض وعظ و تلقین پر نہیں چھوڑی جا سکتی۔ طاقت ور جتھا بنا کر فریاد اور شنوائی کے راستے تک بند کر دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں یہی صورت ہے۔ اس کے خلاف جدوجہد کی ضرورت ہے۔ تاآنکہ وہ وقت آئے کہ ریاست کا سربراہ کہے: تمھارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک طاقت ور ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں، اگر خدا چاہے۔ اور تم میں سے جو طاقت ور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں اگر خدا چاہے" (حضرت ابوبکر صدیقؓ کا خلافت سنبھالنے پر خطبہ، کنز العمال)۔ اور اس کا یہ کہنا صرف کہنا نہ ہو، حقیقت حال ہو۔

○

حضرت اسودؓ بن یزید سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو کیا کرتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: اپنے گھر والوں کی خدمت کرنے والوں میں شامل ہو جاتے تھے، جب نماز کا وقت آتا تھا تو کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔

حضور نبی کریمؐ سے محبت کرنے والوں، محبت کی خواہش رکھنے والوں اور محبت کا دعویٰ کرنے والوں، سب کو اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھنی چاہیے۔ حقیقی محبت تو، آپؐ کے نمونے کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ ہم گھروں میں کس طرح رہتے ہیں؟ رسولؐ اللہ تو گھریلو کاموں میں گھر والوں کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرتے، رسمی نہیں حقیقی تعاون! اس پر عمل کر کے دیکھیے، گھر کس طرح جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

جس طرح نماز پڑھنا دین ہے، یہ بھی دین کا حصہ ہے۔ (گھریلو کاموں میں اتنی مشغولیت بھی نہ ہو کہ نماز کی فکر نہ رہے!)

جو گھر کے کاموں میں ہاتھ لگانے کو توہین سمجھتے ہیں انھیں اپنے عشق رسولؐ اور دین و ایمان کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم معروف کا حکم کرو، منکر سے روکو ورنہ اللہ تم پر برے لوگوں کو حکمران بنا کر مسلط کر دے گا۔ پھر تمھارے اچھے لوگ دعائیں کریں گے تو ان کی دعائیں قبول نہ کی جائیں گی۔ (طبرانی)

اس وقت سے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیے کہ انسان اتنا بے بس ہو جائے کہ، وہ خود کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، اس کی دعائیں نہ سنی جائیں۔

نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا، مسلمانوں کا شعار ہے۔ اس سے ان کی زندگی ہے اور دنیا و آخرت میں عزت و منزلت ہے۔ یہ ترک ہو جائے تو برائی کو برائی نہ سمجھنے بلکہ اچھائی سمجھنے کا مرحلہ بھی آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

اس کی سزا یہ دیتا ہے کہ برے لوگوں کو حکمران بنا کر مسلط کر دیتا ہے۔ افراد کی انفرادی نیکیاں معاشرے کا رخ نہیں موڑ سکتیں۔ اس کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی اللہ کے رسولؐ نے کی۔

○

حضرت علیؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
جسے اللہ نعمت عطا فرمائے، وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ جسے رزق کے ملنے میں تاخیر نظر آئے، وہ استغفار کرے۔ جسے اچانک کوئی مشکل پیش آئے وہ لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ پڑھے۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

نعمتیں بے پایاں ہیں، بے حد و حساب ہیں، شکر کریں تو کر نہیں سکتے۔ لیکن شکر کا رویہ اختیار کرنے والے کتنے ہیں؟ زبان بھی شکر کے کلمات سے تر رہے اور عمل بھی اللہ کو خوش کرنے والے ہوں۔ شکر کرنے پر اس کا وعدہ ہے: لا زیدنکم

رزق کشادہ ہونے کی طلب فطری ہے۔ تاخیر محسوس ہو تو اللہ سے شکایت کے بجائے اپنے اعمال پر نظر ڈال کر استغفار کرنا چاہیے۔ بحیثیت قوم پیش آنے والے مسائل، معاشی تنگی اور پریشانیوں کا حل بھی توبہ اور استغفار ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہی کہا تھا کہ اپنے رب سے استغفار کرو۔ وہ نعمتوں کی بارش کر دے گا۔ استغفار ہی اصل نسخہ ہے، انفرادی بھی، اجتماعی بھی، دل کی توجہ سے، گناہوں سے بچنے کے لیے سچے ارادے سے۔

اللہ تعالیٰ ہی حقیقی کارساز اور مشکلات کو دور کرنے والا ہے۔ اس کے علاوہ نہ کسی کے پاس قوت ہے اور نہ بزرگی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:
جس نے لوگوں کا مال لیا اس حال میں کہ وہ اس کو واپس کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تو اللہ تعالیٰ اسے ادا کرنے کی توفیق دے دے گا اور جو اس ارادے سے لیتا ہے کہ اسے تلف کر دے گا (واپس نہ کرے گا) تو اللہ اس کے مال تلف کر دے گا۔ (صحیح بخاری)

قرض کی واپس کرنے کی اتنی اہمیت ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے مقروض کی نماز جنازہ اس وقت تک نہ پڑھائی جب تک کہ اس کا قرض ادا نہ کر دیا گیا۔ ضرورت کے وقت جو آپ کو قرض دیتا ہے اس کا یہ حق ہے کہ آپ کسی عذر یا بہانے سے ادائیگی میں تاخیر نہ کریں، اسے اولیت دیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرتا ہے، اگر آپ کی نیت نیک ہو۔ بدنیتوں کو جو ادا کرنے کی یا وقت پر ادا کرنے کی نیت نہ رکھتے ہوں، اللہ تعالیٰ ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ قرض کا بوجھ لیے اللہ کے حضور پہنچ جاتے ہیں۔ جو جان بوجھ کر قرض ادا نہیں کرتے یقیناً وہ آخرت کو بھولے ہوئے ہیں اور اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہیں۔

○

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، فرماتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سابقہ دور کے ایک اسرائیلی مسلمان کا ذکر کیا جس نے ایک دوسرے اسرائیلی مسلمان سے ایک ہزار دینار ادھار مانگے تو اس نے کہا: ادھار دے دیتا ہوں لیکن گواہ لے آئیں۔ اس نے جواب میں کہا: اللہ کی گواہی کافی ہے۔ اس نے کہا: اچھا کوئی ضامن لے آؤ۔ اس نے کہا: اللہ کی ضمانت کافی ہے۔ اس نے کہا: آپ نے سچی بات کی ہے۔ چنانچہ ایک میعاد مقرر کر دی اور ایک ہزار دینار ادھار دیے۔ وہ کشتی میں سوار ہو کر سمندر پار چلا گیا۔ اس کام میں لگ گیا جس کے لیے سفر کیا تھا۔ کام ہو گیا تو واپسی کا ارادہ کیا تاکہ بروقت پہنچ کر ادھار لی ہوئی رقم واپس کر دے۔ ساحل پر آیا۔ کشتی کا انتظار کیا لیکن کشتی نہ آئی۔ قرض کی ادائگی کا وقت پورا ہو گیا تھا لیکن ادائگی کے لیے جانے کی کوئی صورت نہ بن پڑی بالآخر اس نے ایک لکڑی لے کر اسے اندر سے کھرچا اور اس میں ایک نالی بنائی۔ اس میں ایک ہزار دینار رکھے اور اس کے ساتھ قرض دینے والے کے نام ایک خط لکھ کر بند کر دیا اور اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتے ہوئے کہا: "اے اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے فلاں آدمی سے ایک ہزار دینار قرض مانگا تھا، اس نے مجھ سے ضامن مانگا تو میں نے کہا اللہ کا ضامن ہونا کافی ہے۔ وہ اس پر راضی ہو گیا، اس نے گواہ مانگا تو میں نے کہا اللہ کی گواہی کافی ہے تو وہ اس پر بھی راضی ہو گیا۔ میں نے واپس جانے کے لیے کشتی تلاش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اب میں یہ رقم تیرے سپرد کرتا ہوں کہ تو اسے پہنچا دے"۔ یہ کہہ کر اس نے لکڑی سے بنائی ہوئی "نالی" سمندر میں پھینک دی۔ دوسری طرف سے میعاد پوری ہونے پر قرض دینے والا سمندر کے ساحل پر آیا تاکہ کسی کشتی میں اس کا مال آئے تو وصول کر لے۔ کشتی تو کوئی نہ آئی لیکن اسے وہ لکڑی نظر آ گئی جس میں اس کا مال بند تھا، اس نے اسے یہ سمجھ کر پکڑ لیا کہ لکڑی ہے۔ جلانے کے کام آئے گی۔ (باقی لکڑیوں کے ساتھ اسے بھی رکھ لیا)۔

لکڑیاں چیریں تو اس کو بھی چیرا۔ دیکھا کہ اس میں تو اشرفیاں بند ہیں اور ایک خط بھی ہے۔ بعد میں مقروض کو کشتی مل گئی تو وہ خود بھی کشتی میں سوار ہو کر آ گیا اور مزید ایک ہزار رقم بھی لے آیا۔ ملاقات ہوئی تو ماجرا بیان کیا۔ کہا کہ میں کشتی کی تلاش میں رہا لیکن کشتی نہ ملی۔ یہ پہلی کشتی ہے جس میں، میں آیا ہوں اور اس کے بعد رقم پیش کی۔ قرض دینے والے نے کہا: آپ نے مجھے کوئی چیز بھیجی تھی؟ اس نے جواباً کہا: میں نے عرض کیا کہ جس کشتی میں سوار ہو کر میں آیا ہوں اس سے پہلے مجھے کوئی کشتی نہ مل سکی۔ اس پر اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف سے رقم پہنچا دی ہے۔ آپ اپنی رقم لے جایئے۔ اللہ آپ کو ہدایت پر قائم و دائم رکھے۔ (صحیح بخاری، کتاب الکفالۃ)

انسان ارادہ کرے، نیت نیک ہو، تو اللہ ضرور مدد کرتا ہے، غیب سے بھی کرتا ہے۔

رسول اللہؐ کا تبسم

محمد رضی الاسلام ندوی

دنیا میں ہزاروں پیغمبر آئے۔ انھوں نے اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا اور اپنی زندگی کا عملی نمونہ پیش کیا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد ان کی تعلیمات مٹ گئیں یا ان میں بہت سی غلط باتوں کی آمیزش ہو گئی اور ان کی زندگی پر پردہ پڑگیا۔ یہ امتیاز صرف خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپؐ کا لایا ہوا پیغام' قرآن مجید کی شکل میں حرف بہ حرف محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اسی طرح آپؐ کی حیات طیبہ بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ آپؐ کی ولادت سے' اور خاص طور پر نبوت سے وفات تک کے تمام واقعات' تمام جزئیات کے ساتھ معلوم ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے آپؐ کی زندگی کے معمولی معمولی واقعات' آپؐ کے روز مرہ کے معمولات اور طبعی اوصاف کو بھی بیان کیا ہے۔ آپؐ کی خلوت و جلوت' نشست و برخاست' آمدورفت' سفر و حضر' خواب و بیداری' بول چال' کھانا پینا' چلنا پھرنا' پہننا اوڑھنا' غرض آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں ہے۔

رسول اللہؐ کی نجی زندگی کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپؐ اپنے متعلقین اور اصحاب کے ساتھ لطف و کرم' محبت و مودت اور نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ آپؐ کے مزاج میں درشتی اور سختی نام کو نہ تھی۔ قرآن نے آپؐ کے اس وصف کو اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ۱۵۹:۳)

"(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے"۔

آپؐ ملنے والوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے' ان سے مسکرا کر بات چیت کرتے' ان کی ظریفانہ مجلسوں میں شریک ہوتے' بسا اوقات ان سے لطیف مزاح بھی فرماتے۔ آپؐ کا یہ برتاؤ تمام طبقات کے ساتھ تھا۔ اندرون خانہ ازواج مطہرات ہوں یا بچے' آپؐ کے قریبی اصحاب ہوں یا اجنبی' سب آپؐ کے بحر الطاف

و عنایات سے فیض یاب ہوتے تھے۔ سیرتِ نبویؐ کا یہ ایک ایسا باب ہے جس سے آپؐ کی نجی زندگی کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

آنحضرتؐ کے قریبی اصحاب کا بیان ہے کہ آپؐ کے روئے اطہر پر ہمیشہ مسکراہٹ اٹکھیلیاں کرتی رہتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن حارثؓ فرماتے ہیں: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی شخص کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا"۔(۱) ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "میں نے کبھی رسول اللہؐ کو ٹھٹھا مار کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپؐ صرف تبسم فرماتے تھے"۔(۲)

احادیث میں "ضحک" (ہنسنا) اور "تبسم" (مسکرانا) کے الفاظ آئے ہیں۔ "ضحک" چہرے کے انبساط کو کہتے ہیں جس سے دانت نظر آ جائیں اور منہ سے ہلکی آواز نکلے۔ اگر آواز زور سے نکلے اور دور تک سنائی دے تو اسے "قہقہہ" اور اگر بالکل نہ نکلے تو اسے "تبسم" کہتے ہیں۔(۳) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیشتر حالات میں صرف تبسم فرماتے تھے۔ بعض خاص مواقع پر آپؐ سے ضحک بھی ثابت ہے۔ بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کسی بات پر اتنی زور سے ہنسے کہ آپؐ کے نواجذ (داڑھ) دکھائی دیے، لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپؐ صحابہ کو زیادہ ہنسنے سے منع فرماتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "زیادہ نہ ہنسو، زیادہ ہنسنا دلوں کو مردہ کر دیتا ہے"۔(۴)

آنحضرتؐ اپنی ازواج کے ساتھ لطف و کرم اور محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ آپؐ ان کے ساتھ خوش طبعی فرماتے اور ان کے درمیان مسرت کے موتی بکھیرتے تھے۔ کبھی کوئی ہنسی کی بات آتی تو بے ساختہ مسکرا دیتے تھے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھی۔ اس وقت تک میں ہلکی پھلکی تھی۔ فربہ بدن نہیں ہوئی تھی۔ آپؐ نے لوگوں کو آگے بڑھ جانے کی ہدایت کی۔ پھر مجھ سے فرمایا: "آؤ دوڑ کا مقابلہ کرتے ہیں"۔ میں آپؐ کے ساتھ دوڑی اور آگے نکل گئی۔ آپؐ خاموش ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ایک مرتبہ پھر مجھے آپؐ کے ساتھ سفر میں جانے کا موقع ملا۔ اس وقت میں فربہ بدن ہو گئی تھی۔ آپؐ نے اس موقع پر بھی اپنے اصحاب کو آگے بڑھ جانے کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے فرمایا: "آؤ دوڑ کا مقابلہ کرتے ہیں"۔ میں آپؐ کے ساتھ دوڑی تو آپؐ مجھ سے آگے نکل گئے۔ آپؐ ہنسنے لگے اور فرمایا: "یہ اس کا بدلہ ہے"۔(۵)

حضرت عائشہؓ ایک دوسرا واقعہ بیان کرتی ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حریرہ (یعنی دودھ، گھی اور آٹے سے تیار کیا ہوا کھانا) لے کر آئی جسے میں نے خود آپؐ کے لیے تیار کیا تھا۔ وہاں حضرت

سودہؓ بھی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے اور ان کے درمیان میں تھے۔ میں نے سودہؓ سے کہا: "کھاؤ"۔ انھوں نے انکار کیا۔ میں نے کہا: "کھاؤ ورنہ تمھارے چہرے پر لتھیڑ دوں گی"۔ انھوں نے پھر بھی انکار کیا۔ میں نے حریرہ میں اپنا ہاتھ ڈالا اور ان کے چہرے پر لیس دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہنسنے لگے۔ آپؐ نے سودہؓ سے فرمایا: "اس کے بھی چہرے پر لتھیڑ دو"۔ (دوسری روایت میں حضرت عائشہؓ کا یہ بیان بھی ہے کہ آپؐ نے اپنا گھٹنا نیچے کر لیا تاکہ سودہؓ مجھ سے بدلہ لے سکیں)۔ چنانچہ انھوں نے بھی پلیٹ سے کچھ لے کر میرے چہرے پر لیس دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنستے رہے"۔(۶)

آپؐ کا خوش طبعی اور خندہ روئی کا یہ معاملہ بچوں کے ساتھ بھی تھا۔ آپؐ ان کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے۔ ان سے پیار بھری باتیں کرتے اور کبھی کبھی لطیف مزاح بھی فرماتے تھے۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہؓ کا ایک بچہ تھا جس کا نام ابو عمیرؓ تھا۔ آنحضرتؐ جب بھی ابو طلحہؓ کے گھر تشریف لے جاتے، اس بچے سے ہنسی مذاق کرتے تھے۔(۷)

ایک مرتبہ بعض لوگوں نے آپؐ کو کھانے کی دعوت دی۔ آپؐ ان کے یہاں جا رہے تھے۔ راستے میں آپؐ کے نواسے، حسینؓ بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ملے۔ آپؐ نے انھیں پکڑنا چاہا۔ وہ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ آپؐ ہنستے ہوئے انھیں پکڑنے کی کوشش کرنے لگے یہاں تک کہ پکڑ لیا۔ پھر اپنا ایک ہاتھ ان کی گدی پر اور دوسرا ان کی ٹھوڑی پر رکھا اور اپنا منہ ان کے منہ پر رکھ کر بوسہ لے لیا۔(۸)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اپنے بھائی سے خندہ روئی سے ملنا بھی باعث اجر و ثواب ہے"۔(۹) آپؐ کی یہ تعلیم محض دوسرے لوگوں کے لیے نہ تھی بلکہ خود آپؐ نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ سے جب بھی میرا سامنا ہوتا، آپؐ مسکراتے ہوئے ملتے تھے۔(۱۰) حضرت جابرؓ کا بھی ایسا ہی بیان ہے۔(۱۱) آنحضرتؐ کا یہ برتاؤ صرف اپنے عزیزوں یا قریبی اصحاب کے ساتھ ہی نہ تھا بلکہ آپؐ کا یہ فیضان ان لوگوں کے لیے بھی وسیع تھا جو سماج میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے تھے یا جو آپؐ کے ساتھ اکھڑپن اور عداوت سے پیش آتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپؐ سے ملنے آیا۔ اس وقت گھر میں حضرت عائشہؓ موجود تھیں۔ آپؐ نے آہستہ سے فرمایا: "یہ برا آدمی ہے"۔ پھر حضرت عائشہؓ سے پردہ کروا کر اس شخص کو اندر بلا لیا اور ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپؐ نے اسے برا آدمی بھی قرار دیا اور پھر اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں بھی کیں"۔ آپؐ نے جواب دیا: "سب سے برا آدمی وہ ہے جس کے شر کی وجہ سے لوگ اس سے بچیں"۔(۱۲)

ایک مرتبہ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ ساتھ

میں تھے۔ آپؐ اس وقت موٹے حاشیے کی ایک نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ راستے میں ایک بدو ملا۔ اس نے آپؐ کی چادر پکڑ کر اتنے زور سے کھینچا کہ گردن پر اس کا نشان پڑ گیا اور کہا: "اے محمدؐ! اللہ نے تمھیں جو مال دیا ہے اس میں سے مجھے بھی دو"۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کی اس حرکت پر مسکرائے اور اسے کچھ مال دینے کا حکم دیا۔(۱۳)

اللہ کے رسولؐ اپنے اصحاب کے درمیان ہوتے، اس وقت آپؐ کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہ ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔ صحابہ کچھ بیان کرتے تو آپؐ بھی ان کی گفتگو میں شریک ہوتے۔ کوئی بات تفریح طبع کی ہوتی تو آپؐ بھی اس سے پورا مزہ لیتے۔ صحابہ کسی بات پر ہنستے تو آپؐ بھی ان کا ساتھ دیتے۔ کسی صحابی کی کوئی "حرکت" یا کوئی انداز آپؐ کے روئے انور پر مسکراہٹیں بکھیر دیتی تھی۔

حضرت ابو رمثہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے میری طرف اشارہ کر کے میرے باپ سے دریافت کیا: "یہ تمھارا بیٹا ہے؟" میرے باپ نے جواب دیا: "جی ہاں، رب کعبہ کی قسم! میں بالکل صحیح کہہ رہا ہوں۔ یہ میرا بیٹا ہے"۔

ابو رمثہؓ بیان کرتے ہیں: میری شباہت میرے باپ سے ملتی جلتی تھی۔ پھر بھی قسم کھا کر میرے باپ کے اس انداز سے جواب دینے پر، اللہ کے رسولؐ ہنس پڑے اور فرمایا: "ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ تمھارا بیٹا کوئی جرم کرے گا تو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور تمھارے کسی غلط کام کا مواخذہ تمھارے بیٹے سے نہیں ہوگا"۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (فاطر ۳۵:۱۸) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا"۔(۱۴)

ایک صحابیہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ ان کے شوہر نے انھیں مارا ہے۔ آپؐ نے ان کے شوہر کو بلا کر وجہ دریافت کی۔ انھوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! یہ مجھے ستاتی ہے"۔ حضورؐ نے فرمایا: "سلمٰی تم نے کیوں ستایا؟" صحابیہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! میں نے ستایا نہیں ہے۔ بات یہ تھی کہ نماز پڑھنے کے دوران ان کی ریاح خارج ہو گئی تو میں نے کہا کہ اللہ کے رسولؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اگر کسی کی ریاح خارج ہو جائے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اسے دوبارہ وضو کرنا چاہیے۔ بس اسی بات پر انھوں نے مجھے مارا۔ یہ سن کر اللہ کے رسولؐ ہنسنے لگے اور فرمایا: "اے ابو رافعؓ! اس نے تو تم سے اچھی بات کہی تھی"۔(۱۵)

حضورؐ کی ایک مجلس میں دیہات میں رہنے والے ایک صحابی موجود تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "جنت میں ایک شخص اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کرے گا کہ میں کھیتی کرنا چاہتا ہوں"۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا جو کچھ تمھیں حاصل ہے وہ کافی نہیں؟" وہ عرض کرے گا: "کافی ہے لیکن میری خواہش ہے کہ کھیتی کروں"۔

چنانچہ وہ بوائی کرے گا اور دیکھتے ہی دیکھتے کھیتی بڑھ کر، پک کر تیار ہو جائے گی۔ پھر کٹائی ہو کر پہاڑ کی طرح ڈھیر لگ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "یہ سب تمھارا ہے"۔ دیہاتی نے برجستہ کہا: "خدا کی قسم وہ کوئی قریشی یا انصاری ہو گا۔ وہی لوگ کھیتی کرتے ہیں"۔ اس کی اس برجستگی پر اللہ کے رسول ہنس دیے"۔(۱۶)

بسااوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ بغیر کسی بات کے، اچانک ہنس دیتے۔ وہاں موجود صحابہ ہنسی کی وجہ دریافت کرتے یا دریافت نہ بھی کرتے، تب بھی آپؐ خود ہی اس کی وضاحت فرما دیتے اور کسی ایسی حکمت کی بات کی طرف اشارہ فرماتے جو درس و تعلیم سے پر ہوتی۔

حضرت صہیبؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ آپؐ کے ارد گرد صحابہ کی ایک جماعت تھی۔ اچانک آپؐ ہنس دیے۔ پھر خود ہی صحابہ سے مخاطب ہوئے: "کیا تم لوگ پوچھو گے نہیں کہ میں کیوں ہنس رہا ہوں؟" صحابہ نے عرض کیا: "کیا بات ہے اے اللہ کے رسول!" فرمایا: "مومن کا معاملہ بھی عجیب و غریب ہے۔ اس کے ہر معاملے میں خیر ہے۔ اگر اسے کوئی بھلائی حاصل ہوتی ہے اور وہ اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس میں اس کے لیے خیر ہوتا ہے۔ اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے اور اس پر وہ صبر کرتا ہے تو اس صورت میں بھی وہ خیر کا مستحق ہوتا ہے"۔(۱۷)

ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے پانی منگوایا اور وضو کیا۔ پھر ہنسنے لگے۔ پھر خود دریافت کیا: "کیا تم لوگ میرے ہنسنے کی وجہ دریافت نہیں کرو گے؟" صحابہ نے عرض کیا: "یارسول اللہؐ! فرمایئے"۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "بندہ جب وضو میں اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ چہرے سے سرزد ہونے والی خطاؤں کو معاف کر دیتا ہے۔ جب ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ سے سرزد ہونے والی خطاؤں سے درگزر فرما دیتا ہے۔ اسی طرح جب سر کا مسح کرتا اور اپنے پیر دھوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان اعضا سے ہونے والی لغزشوں کو معاف کر دیتا ہے"۔(۱۸)

ایک مرتبہ آپؐ سواری پر سوار ہوئے تو آپؐ نے یہ دعا پڑھی: **انی ظلمت نفسی فاغفرلی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت** (اے اللہ میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ تو میرے گناہوں کو معاف کر دے۔ تیرے علاوہ اور کوئی گناہوں کو معاف نہیں کر سکتا) پھر ہنسنے لگے۔ اس وقت وہاں حضرت علی بن ابی طالبؓ موجود تھے۔ انھوں نے سوال کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ کیوں ہنسے؟ فرمایا: "بندہ جب اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے اور فرماتا ہے کہ اس بندے کو یقین ہے کہ اس کے گناہوں کو معاف کرنے والا میرے علاوہ اور کوئی نہیں"۔(۱۹)

احادیث میں بعض ایسے مواقع کی تفصیلات بھی محفوظ ہیں جب اللہ کے رسولؐ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس کے لیے احادیث میں حتیٰ بدت نواجذہ (یہاں تک کہ داڑھ کے دانت نظر آنے لگے) کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ عربی زبان میں دانتوں کے لیے مختلف الفاظ آتے ہیں۔ سامنے کے اوپر نیچے کے دو دو دانتوں کو

"ثنایا" اور ان کے بغل کے دانتوں (کچلی کے دانت) کو "انیاب" کہتے ہیں اور ان دونوں کے مجموعہ پر "ضواحک" کا اطلاق کیا جاتا ہے، یعنی وہ دانت جو ہنستے وقت دکھائی دیتے ہیں۔ "انیاب" کے بغل میں پائے جانے والے دانتوں کو "نواجذ". (داڑھ کے دانت) کہتے ہیں۔ یہ اس وقت دکھائی دیتے ہیں جب آدمی کھلکھلا کر ہنسے۔ ایسے چند مواقع کا تذکرہ جب اللہ کے رسولؐ کو بے ساختہ ہنسی آگئی تھی اور آپؐ کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے، دلچسپی کا باعث ہو گا۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن ایک شخص کو بارگاہ الٰہی میں لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائے گا: اس کے سامنے اس کے چھوٹے چھوٹے گناہ پیش کرو۔ اس وقت اس کے بڑے بڑے گناہ چھپا لیے جائیں گے۔ پھر اس سے کہا جائے گا۔ تم نے فلاں دن یہ گناہ اور فلاں دن یہ گناہ کیا تھا۔ وہ انکار نہ کر سکے گا۔ اقرار کرتا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی لاحق ہو گا کہ ابھی تو بڑے بڑے گناہوں کا حساب باقی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اسے اس کی ہر برائی کے بدلے ایک نیکی کا اجر دے دو۔ یہ الٰہی الطاف و عنایات دیکھ کر وہ بول اٹھے گا: "میرے اور بھی بہت سے گناہ ہیں جو میں یہاں نہیں دیکھ رہا ہوں"۔ حضرت ابوذرؓ بیان کرتے ہیں: میں نے دیکھا کہ یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھلکھلا کر ہنس پڑے"۔ (۲۰)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "مجھے معلوم ہے کہ سب سے آخر میں جہنم سے نکل کر جنت میں جانے والا شخص کون ہو گا؟ ایک شخص جہنم سے گھسٹتا ہوا نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: "جنت میں چلے جاؤ"۔ وہ جنت کی طرف جائے گا تو اسے ایسا لگے گا کہ جنت بھر گئی ہے۔ وہ واپس آکر عرض کرے گا: "اے میرے رب! جنت تو بھر گئی ہے"۔ اللہ تعالیٰ اس سے پھر فرمائے گا۔ "جا کر تو دیکھو"۔ وہ دوبارہ جائے گا۔ اس بار بھی اسے محسوس ہو گا کہ جنت میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں بچی ہے۔ وہ واپس آکر عرض کرے گا: "اے میرے رب! جنت میں اب کوئی جگہ نہیں ہے"۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "تم جنت میں جاؤ، وہاں تمہارے لیے دنیا کے برابر اور اس کا دس گنا ہے"۔ وہ عرض کرے گا: "اے اللہ! آپ شہنشاہ ہو کر مجھ سے مذاق کرتے ہیں!!" حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں، یہ فرماتے ہوئے اللہ کے رسولؐ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ (۲۱)

یہ چند واقعات ہمارے سامنے سیرت نبویؐ کا ایک دل کش باب وا کرتے ہیں جہاں الفت و محبت ہے، لطف و کرم ہے، خوش طبعی اور خندہ روئی ہے، تفریح طبع اور مزاح لطیف ہے، مسکراہٹیں اور کھلکھلاہٹیں ہیں۔ یہ واقعات جہاں ایک طرف ہمارے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی کا ایک پہلو روشن کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف ہمیں زندگی گزارنے اور متعلقین کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ایک اسوہ بھی

دکھاتے ہیں اور ان سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ، بزرگی اور عظمت چہرے پر رعونت طاری رکھنے، پیشانی پر شکن ڈالنے، گردن ٹیڑھی کر کے بات کرنے یا مہربہ لب رہنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل زندگی خوشیاں بانٹنے اور مسکراہٹیں بکھیرنے سے عبارت ہے۔

حواشی

(۱) شمائل ترمذی، باب ماجاء فی ضحک رسول اللہؐ

(۲) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب الضحک والتبسم، کتاب التفسیر، سورہ احقاف۔

(۳) فتح الباری شرح صحیح بخاری، ابن حجر عسقلانی، دارالمعرفہ بیروت، ۱۰/ ۵۰۴۔

(۴) جامع ترمذی، ابواب الزھد۔

(۵) مسند احمد، ۶/ ۲۶۴۔

(۶) مجمع الزوائد، ہیثمی ۴/ ۳۱۶۔

(۷) مسند احمد، ۳/ ۱۱۵-۲۰۱۔

(۸) مسند احمد، ۴/ ۱۷۲۔

(۹) جامع الترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف۔

(۱۰) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب التبسم والضحک۔

(۱۱) شمائل ترمذی، باب ماجاء فی ضحک رسول اللہ۔

(۱۲) موطا، کتاب حسن الخلق، باب ماجاء فی حسن الخلق، صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما یجوز من اغتیاب اهل الفساد۔

(۱۳) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب التبسم والضحک۔

(۱۴) سنن دارمی، کتاب الدیات، باب یواخذ احد بجنایة غیره

(۱۵) مسند احمد، ۶/ ۲۷۲۔

(۱۶) صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعه، باب بدون ترجمه

(۱۷) سنن دارمی، کتاب الرقائق، باب المومن یوجر فی کل شئی، مسند احمد ۶/ ۱۶۔

(۱۸) مسند احمد ۱/ ۵۸۔

(۱۹) شمائل ترمذی، باب ماجاء فی ضحک رسول اللہ۔

(۲۰) شمائل ترمذی، حوالہ سابق۔

(۲۱) صحیح بخاری، کتاب الرقائق، باب صفة الجنة والنار۔

قرآن کوئز

۱- کیا آپ قرآن پڑھ سکتے ہیں

۲- کیا آپ کے گھر میں قرآن پاک کا آسان ترجمہ موجود ہے

۳- کیا آپ نماز کے دوران قرآن کی تلاوت سمجھ سکتے ہیں

۴- کیا آپ نے گھر والوں کو قرآن پڑھانے اور سمجھانے کا کوئی بندوبست کیا ہے

۵- کیا آپ کے بچوں کو سکول میں قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے

۶- کیا آپ قرآن سمجھنے کے لیے آڈیو، وڈیو یا کمپیوٹر سے مدد لیتے ہیں

۷- کیا آپ کے گھر والوں میں سے کوئی قرآن فہمی کے کسی ادارے سے فائدہ اٹھاتا ہے

۸- کیا آپ نے قرآن سمجھنے کے لیے کبھی کسی پروگرام میں جانے کا ارادہ کیا ہے

۹- کیا آپ قرآن کی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی میں تبدیلی محسوس کرتے ہیں

۱۰- کیا اللہ کے پیغام کو سمجھنے کے لیے وقت صرف کرنے کا کوئی فائدہ ہے

اور یقیناً ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان بنایا ہے تو ہے کوئی سمجھنے والا

(القرآن)

قرآن فہمی پراجیکٹ

۲۹ جیل روڈ – گلبرگ ۵ لاہور

فون ۳۔۴۔۵۔۵ - ۴۷۴۔۵۷۵

غضِ بصر ــــ نگاہ کی حفاظت و عفّت

افادات مولانا اشرف علی تھانویؒ

اللہ تعالیٰ سورہ المومن میں ارشاد فرماتے ہیں: یَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡاَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِى الصُّدُوۡرُ (۱۹:۴۰)'
ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتے ہیں اور جس شے کو سینے میں چھپاتے ہو' اس کو بھی جانتے ہیں''۔ یہ ایک ایسی آیت ہے جس کے الفاظ تھوڑے ہیں اور معانی بہت ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک امر قبیح پر مطلع فرمایا ہے۔ جس مرض کا اس میں بیان ہے آج کل اس میں بہت لوگ مبتلا ہیں۔ مرض سے یہاں مراد معصیت ہے۔ جس طرح مرض کی حقیقت یہ ہے کہ جسم میں اعتدال نہ رہے' اس طرح معصیت میں بھی قلب کے مزاج میں اعتدال نہیں رہتا اور اس کا انجام جسمانی مرض سے زیادہ مضر ہے۔

کسی نے بقراط سے پوچھا تھا کہ امراض میں کون سا مرض زیادہ شدید ہے؟ اس نے کہا کہ جس مرض کو خفیف سمجھا جائے' وہ بہت شدید ہے۔ اس لیے کہ وہ لاعلاج ہے۔ اس طرح جس گناہ کو ہلکا سمجھا جائے' وہ بھی بہت شدید اور لاعلاج ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو گناہوں کا ذکر فرمایا ہے' آنکھوں کے گناہ اور دل کے گناہ کا۔

یوں تو آنکھوں کے بہت سے گناہ ہیں لیکن یہاں ایک خاص گناہ کا ذکر کیا ہے' وہ ہے بدنگاہی۔ اس طرح دل کے بہت سے گناہ ہیں لیکن بقرینہ سباق خاص گناہ کا ذکر ہے یعنی نیت بری ہونا۔ ان دونوں گناہوں کو لوگ گناہ سمجھتے ہیں لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ جس درجہ ان کی مضرت ہے' اس قدر نہیں سمجھتے۔ اگرچہ گناہ کا ادنیٰ اثر یہ ہونا چاہیے کہ دل میلا ہو جائے مگر اس گناہ کے بعد دل بھی میلا نہیں ہوتا۔ اس لیے لوگ اسے بہت خفیف سمجھتے ہیں۔ کسی عورت کو دیکھ لیا' کسی لڑکے کو گھور لیا' اس کو ایسا سمجھتے ہیں کہ جیسے کسی اچھے مکان کو دیکھ لیا یا کسی پھول کو دیکھ لیا۔ پھر یہ گناہ ایسا ہے کہ اس سے بوڑھے بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔ کھلی بدکاری سے تو اکثر لوگ محفوظ ہیں کیونکہ اس کے لیے بڑے اہتمام کرنے پڑتے ہیں۔ اول تو جس سے ایسا فعل کرے' وہ راضی ہو اور رقم بھی پاس ہو۔ نیز شرم و حیا بھی مانع نہ ہو۔ غرض اس طرح کے بہت سے موانع حائل رہتے ہیں۔ اس لیے شائستہ آدمی' خصوصاً جو دین دار سمجھے جاتے ہیں' اس میں بہت کم مبتلا ہوتے ہیں۔ بخلاف آنکھوں کے گناہ کے کہ اس میں اس طرح کے موانع نہیں ہیں' نہ رقم کی ضرورت ہے'

نہ بدنامی کا خدشہ کیونکہ اس کی خبر تو اللہ ہی کو ہے کہ کس نیت سے کس کو دیکھا ہے۔ مولوی صاحب، مولوی صاحب ہی رہتے ہیں اور قاری صاحب، قاری صاحب ہی رہتے ہیں۔ نہ اس فعل سے ان کی مولویت میں فرق آتا ہے اور نہ قاری صاحب کے قاری ہونے میں کوئی دھبہ لگتا ہے۔ دوسرے گناہوں کی خبر تو اوروں کو بھی ہوتی ہے مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہوتی۔ معصیت کرتے ہیں اور نیک نام بھی رہتے ہیں۔ لڑکوں کو گھورتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کو بچوں سے بڑی محبت ہے۔ جب آنکھوں کے گناہ کی خبر نہیں ہوتی تو دل کے گناہ کی کس طرح اطلاع ہو سکتی ہے۔

اہل کشف نے لکھا ہے کہ بدنگاہی سے آنکھوں میں ایک ایسی ظلمت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کو تھوڑی سی بصیرت ہو، وہ پہچان لے گا کہ اس شخص کی نگاہ پاک نہیں ہے۔ اگر دو شخص جو ہر لحاظ سے ایک جیسے ہوں، لیکن ان میں سے ایک فاجر ہو اور دوسرا متقی ہو، تو جب چاہو دیکھ لو کہ متقی کی آنکھ میں رونق اور دل فریبی ہوگی اور فاسق کی آنکھ میں ایک قسم کی ظلمت اور بے رونقی۔ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور وہ کسی کو بری نگاہ سے دیکھ کر آیا تھا تو حضرت عثمانؓ نے خاص طور پر تو اس کو کچھ نہ فرمایا لیکن یہ فرمایا: "مابان اقوام یترشح الزنا من اعینھم" یعنی لوگوں کا کیا حال ہے کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپکتا ہے۔ اہل کشف خصوصیت سے کسی کو کچھ نہیں کہتے بلکہ عیب پوشی کرتے ہیں لیکن جو اس فعل میں مبتلا ہے، وہ سمجھ جائے گا کہ مجھے فرما رہے ہیں۔

بدنگاہی کا گناہ اکثر چھپا ہی رہتا ہے۔ اس لیے لوگ بے دھڑک اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ مرض اول جوانی میں پیدا ہوتا ہے بلکہ سب گناہوں کی یہی شان ہے کہ اول جوانی کے تقاضے کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ پھر وہ مرض اور روگ لگ جاتا ہے اور لب گور تک کیا جاتا ہے۔ لیکن جوان اور بوڑھے میں فرق یہ ہے کہ جوان آدمی تو معالجہ کے لیے کسی سے کہہ بھی دیتا ہے لیکن بوڑھا آدمی شرم کی وجہ سے کسی سے کہتا بھی نہیں ہے۔ پس اس کے مخفی رہنے اور خفیف ہونے کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت اس میں مبتلا رہتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگ اس سے واقف نہیں ہیں، ہم ہی واقف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے اس گناہ کی کسی کو خبر نہیں ہے، صحیح نہیں۔ اس کی خبر ایسے کو ہے کہ جس کو خبر ہو جانا غضب ہے، اس لیے کہ اس کو تم پر پوری قدرت حاصل ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اس گناہ کا ذکر فرما کر اس کی سزا بیان نہیں فرمائی بخلاف دیگر معاصی کے کہ ان کی سزا بھی ساتھ ساتھ بیان فرما دی ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے کہ لوگوں کی طبیعتیں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں کے لیے سزا اور سختی گناہ سے روکنے کے لیے کارگر ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو حیادار ہوتے ہیں، اس گناہ کی تشہیر سے گڑ جاتے ہیں کہ اگر لوگوں کو اس کی خبر ہوئی تو باعث بدنامی ہوگا بالخصوص جب یہ معلوم ہو کہ ہمارا یہ جرم معاف بھی ہو جائے گا تو اور بھی زیادہ شرم محسوس کرتے ہیں۔ غرض دو قسم کے

لوگ ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو سزا کا نام سن کر رکتے ہیں اور ایک وہ جو صرف اطلاع کی خبر دینے سے شرماتے ہیں اور اس کام کے قریب نہیں جاتے۔ چنانچہ جو بے حیا تھے وہ تو یوں رکے کہ یعلم میں اشارہ سزا کی طرف بھی ہے، دوسرے اس لیے رکے کہ شرم سے گڑ گئے کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو جانتے ہیں۔ اس بات سے اندازہ ہوا کہ یہ مرض کتنا مہلک ہے۔

اب ہمیں اپنی حالت دیکھنی چاہیے کہ ہمارے اندر اس معصیت سے بچنے کا کتنا اہتمام ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ شاید ہزار میں ایک اس سے بچا ہوا ہو، ورنہ یہ ابتلائے عام ہے اور اس کو نہایت درجہ خفیف کہتے ہیں۔ جو لوگ جوان ہیں، ان کو تو اس کا احساس ہوتا ہے اور جن کی قوت شہویہ خفیف ہو گئی ہے، ان کو تو احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو تو شہوت ہی نہیں ہے، اس لیے کوئی حرج نہیں ہے۔ سو ان کو مرض کا بھی پتا نہیں لگتا۔ بعضوں کو ایک اور طرح سے دھوکہ ہوتا ہے، وہ یہ کہ شیطان بہکاتا ہے کہ جیسے کسی پھول، اچھے کپڑے اور اچھے مکان وغیرہ کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے، ایسے ہی اچھی صورت دیکھنے کو بھی دل چاہتا ہے۔ یہ سراسر دھوکہ ہے۔ یاد رکھو کہ رغبت کی مختلف قسمیں ہیں۔ جیسی رغبت پھول کی طرف ہوتی ہے، ویسی انسان کی طرف نہیں ہوتی۔ اچھے کپڑے کو دیکھ کر کبھی جی نہیں چاہتا کہ اس کو گلے لگا لوں یا چمٹا لوں جبکہ انسان کی طرف ایسی ہی رغبت ہوتی ہے۔

ایک اور دھوکہ یہ بھی ہے کہ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ جیسے اپنے بیٹے کو دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ گلے لگا لوں، اس طرح دوسرے کے بچے کو دیکھ کر بھی ہمارا ایسا ہی جی چاہتا ہے۔ حالانکہ اپنے بچوں کو گلے لگانا، چمٹانا اور طرح کا ہے، اس میں شہوت کی آمیزش نہیں ہوتی۔ جبکہ دوسرے کی اولاد کی طرف اور قسم کا میلان ہے کہ اس میں گلے لگانے سے بھی آگے بڑھنے کو بعض کا جی چاہتا ہے۔ لڑکوں کی رغبت تو سم قاتل ہے۔ نصوص میں تو اس کی حرمت ہے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی جو اس کے آثار لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سخت بلا ہے۔ ایک بزرگ مطلق نظر کے لیے فرماتے ہیں: "النظرة سهم من سهام ابليس" یعنی نگاہ ابلیس کے تیروں میں سے ایک تیر ہے۔ حضرت ابوالقاسم قشیریؒ دونوں امر کی نسبت فرماتے ہیں کہ سالک کے لیے مردوں اور عورتوں کی مخالطت رہزن ہے۔ ایک بزرگ کا خاص مردوں کے حق میں قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنی بارگاہ سے مردود کرنا چاہتے ہیں، اس کو لڑکوں کی محبت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ غرض یہ بہت بہت مضرت کی چیز ہے۔

دوسرے معاصی اور بدنگاہی کی معصیت میں ایک اور فرق بھی ہے وہ یہ کہ اور گناہوں کے کرنے کے بعد ان کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور دل بھر جاتا ہے مگر بدنگاہی ایسی شے ہے کہ جب صادر ہوتی ہے تو اور زیادہ تقاضا ہوتا ہے۔ دیکھیے آدمی کھانا کھاتا ہے اور سیر ہو جاتا ہے، پانی پیتا ہے اور پیاس بجھ جاتی ہے، مگر یہ نظر ایسی بلا ہے کہ اس سے سیری نہیں ہوتی۔ اس حیثیت سے یہ گناہ تمام گناہوں سے بڑھ کر ہے۔

یہ گناہ اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے۔ چنانچہ حدیث شریف ہے: "انا غیر اللہ اغیر من ومن غیرۃ حرم الفواحش ما ظہر منہا وما بطن" یعنی میں بہت غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ ہم سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اس غیرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بے شرمی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے' چاہے اس کی برائی کھلی ہو یا چھپی ہو۔ یہ سب فواحش ہیں۔ آنکھ سے دیکھنا' ہاتھ سے پکڑنا' پاؤں سے چلنا' ان سب کو شارع نے زنا ٹھیرایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا دیکھنا ہے' کان زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا سننا ہے اور زبان بھی زنا کرتی ہے' اس کا زنا بولنا ہے۔ یہ تمام فواحش ہیں جو اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہیں"۔

یہ جان لینے کے بعد کہ بدنگاہی ہر پہلو سے حرام اور گناہ کبیرہ ہے' آگے فرماتے ہیں وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ یعنی جس شے کو سینے میں چھپاتے ہیں' اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتے ہیں۔ یہ بات پہلے سے اشد ہے یعنی معصیت صرف نگاہ ہی سے نہیں' بلکہ دل سے بھی ہوتی ہے۔ بہت لوگ دل سے سوچا کرتے ہیں اور عورتوں اور مردوں کا تصور کرتے ہیں اور خیال ہی سے فرما لیتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم متقی ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ یہ سب تلبیس ابلیس لعین ہے۔ بلکہ بعض مرتبہ دل کے اندر سوچنے اور دل ہی دل میں باتیں کرنے سے اور زیادہ فتنہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بدنگاہی میں تو بعض مرتبہ بدصورت اور قبیح شکلیں بھی نظر آ سکتی ہیں اور دل کے اندر باتیں کرنے میں تو طبیعت کو زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے اور قلب سے کسی طرح وہ بات نہیں نکلتی۔ چونکہ قلب میں کانوں کے واسطے سے بھی باتیں اس قسم کی پہنچتی ہیں اس لیے جس طرح آنکھوں کی حفاظت ضروری ہے' کانوں کی نگہداشت بھی ضروری ہے۔ اس لیے ایسے قصے اور حکایات نہ سنیں' نہ ہی ایسی محفلوں میں شرکت کریں جہاں گانا بجانا ہو رہا ہو۔ بعض مرتبہ تو خود قلب ہی سے معصیت صادر ہوتی ہے' مثلاً پہلے سے دیکھی ہوئی صورتیں یاد آتی ہیں اور ان کے تصور سے انسان لذت محسوس کرتا ہے۔ معصیت قلب کا آنکھوں کی معصیت سے اشد ہونا ایک اور وجہ سے بھی ہے وہ یہ کہ قلب سے سوچنے اور آنکھوں سے دیکھنے میں ایک فرق اور بھی ہے۔ آنکھوں کے گناہ کی صورت میں اس فعل کو کوئی اور بھی دیکھ سکتا ہے۔ گو نیت پر مطلع نہ ہو لیکن دل کے اندر سوچنے کے فعل کو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی اطلاع سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں ہوتی۔ اس لیے اس سے وہی بچے گا جس کے قلب میں تقویٰ ہو۔

اس مرض کے ازالے میں تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ قلب کو باوجود تقاضے کے روکنا' دوسرے یہ کہ اس تقاضے اور خواہش کو ضعیف کر دینا اور بالآخر اس خواہش کا قلع قمع کر دینا۔

ان میں سے قلب کو روکنا یعنی دل کو خود اس طرف متوجہ نہ ہونے دینا' یہ امر تو اختیاری ہے کہ اگر خیال آپ سے آپ آ جائے تو اس کو روکو۔ اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ جب قلب کسی حسین کی طرف مائل ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً کریہہ المنظر' بدشکل' بدصورت اور بدہیئت کی طرف دیکھو۔ اگر کوئی موجود نہ ہو تو کسی ایسے بدصورت کا خیال کرو' مثلاً ایک شخص ہے جو کالے رنگ کا ہے' چہرے پر چیچک کے

داغ ہیں، آنکھوں سے اندھا ہے، سر گنجا ہے، رال بہہ رہی ہے، دانت آگے کو نکلے ہوئے ہیں، ناک سے نکتا ہے، ہونٹ بڑے بڑے ہیں اور مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ اس شخص کی خیالی تصویر بنا لینے سے ان شاء اللہ تعالٰی وہ فساد جو کسی حسین کے دیکھنے سے قلب میں ہوتا ہے، جاتا رہے گا۔ دوبارہ خیال آنے پر پھر وہی تصور ذہن میں لاؤ۔ اگر یہ مراقبہ کارگر نہ ہو اور بار بار پھر اس حسین کا تصور ستائے تو یوں خیال کرو کہ ایک روز یہ شخص مرے گا اور قبر میں جائے گا۔ وہاں اس کا نازک بدن گل سڑ جائے گا اور کیڑے اس کو کھائیں گے۔ یہ تو فوری علاج ہے۔ آیندہ کے لیے تقاضا پیدا ہونے کا علاج یہ ہے کہ ذکر اللہ کی کثرت کرو۔ دوسرے یہ کہ عذاب الٰہی کا تصور کرو۔ تیسرے یہ کہ تصور کرو کہ اللہ تعالٰی یہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کو مجھ پر پوری قدرت ہے۔ امید ہے طویل مراقبات اور کثرت مجاہدہ نفس سے یہ چور، دل سے نکل جائے گا۔ لیکن یہ مرض جلدی دور نہ ہو گا، اس لیے جلدی نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ ایسا پرانا مرض ایک دن یا ایک ہفتے میں نہیں جاتا۔ اس لیے ہمت نہیں ہارنا چاہیے اور مسلسل مجاہدہ کرتے رہنا چاہیے۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ تقاضا ضعیف ہو جائے گا اور قابو میں آ جائے گا۔

تیسرا درجہ یہ کہ اس خواہش کا پوری طرح خاتمہ ہو جائے اور اس کی طرف میلان ہی کبھی پیدا نہ ہو جس کے حصول کے لیے نادان لوگ طالب ہوتے ہیں اور اس کے حاصل نہ ہونے پر پریشان ہوتے ہیں۔ یعنی جب اپنے اندر کسی وقت ایسا میلان پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا سب ذکر اور مجاہدہ ضائع ہو گیا حتیٰ کہ ایسے کلمات پریشانی میں ان کے منہ سے نکل جاتے ہیں کہ بے ادبی اور گستاخی ہو جاتی ہے، مثلاً ہم اتنے زور سے طلب حق میں رہے مگر ہم پر رحم نہیں آتا کہ ویسے ہی محروم ہیں۔ یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ ہرگز مطلوب نہیں کہ خواہش ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے۔ اگر خواہش ہی جاتی رہے تو گناہ سے بچنے میں کوئی کمال نہیں۔ اندھا اگر فخر کرے گا کہ میں دیکھتا نہیں تو یہ کون سی فخر کی بات ہے۔ دیکھے گا کیا، جب کہ دیکھنے کا آلہ نہیں ہے۔ اگر عنین عفت کا دعویٰ کرے تو کیا کمال ہے۔ لطف اور کمال مطلوب تو یہ ہے کہ گناہ کر سکو اور پھر اپنے دل کو روکو۔ میں نے فوری علاج اور تقاضا روکنے کی تدبیر دونوں بیان کر دیے ہیں۔ رہا خواہش کا زائل کر دینا، یہ مطلوب نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجھے اس گناہ پر متنبہ کرنا مقصود ہے، اس لیے کہ اس گناہ کا ابتلا عام ہے، جو نیک کہلاتے ہیں، وہ بھی اس میں مبتلا ہیں۔ خدا کے واسطے اس سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ایک اور تدبیر بھی آزمائی جا سکتی ہے، وہ یہ کہ جب قلب میں ایسا خیال پیدا ہو تو وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو اور توبہ کرو اور اللہ تعالٰی سے دعا کرو۔ جب بھی بدنگاہی کا صدور ہو، یا دل میں تقاضا پیدا ہو، فوراً ایسا ہی کرو۔ ایک دن تو بہت سی رکعتیں پڑھنا پڑیں گی۔ دوسرے دن بہت کم ایسا خیال آئے گا۔ اس طرح یہ مرض بتدریج نکل جائے گا۔ اس لیے کہ نفس پر نماز بڑی گراں ہے۔ چنانچہ بدنگاہی کے ذرا سے مزے کے لیے، ہر وقت نماز پڑھنا

مصیبت معلوم ہو گا۔ پھر ایسے وسوسے سے محفوظ رہے گا۔

☆[اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس سے استعانت بھی طلب کرتے رہنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درج ذیل دعائیں احادیث میں مذکور ہیں جو بد نگاہی سے بچنے اور تزکیہ قلب کے لیے کارگر ثابت ہوں گی:

عن ام معبد الخزاعیة مرفوعاً اللھم طھر قلبی من النفاق وعملی من الریاء ولسانی من الکذب وعینی من الخیانہ فانک لتعلم فائنہ الاعین وما تخفی الصدور (رواہ الحکیم ترمذی والخطیب)

ام معبد خزاعیہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا روایت کی ہے: "اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے، میرے اعمال کو ریا سے، میری زبان کو جھوٹ سے، اور میری آنکھوں کو خیانت سے بالکل پاک صاف کر دے۔ تو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی چیز مخفی نہیں ہے"۔

عن شکل بن حمید قال قلت یانبی اللّٰہ علمی تعوذاً العوذ بہ فاخذ بکفی وقال قل اللھم انی اعوذ بک من شر سمعی ومن شر بصری ومن شر لسانی ومن شر قلبی ومن شر عینیں (رواہ ابو داؤد، الترمذی، النسائی)

شکل بن حمید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی تعوذ تعلیم فرما دیجیے۔ (یعنی کوئی ایسی دعا بتا دیجیے) جس کے ذریعے میں اللہ سے پناہ و حفاظت طلب کیا کروں۔ آپؐ نے میرا ہاتھ اپنے دست مبارک میں تھام کر فرمایا: "کہو، اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اپنے کانوں کے شر سے، اپنی نگاہوں کے شر سے، اپنی زبان کے شر سے، اور اپنے قلب کے شر سے اور اپنے مادہ شہوت کے شر سے"۔

یہ دونوں احادیث مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی معارف الحدیث، جلد پنجم سے ماخوذ ہیں۔ آخری حدیث کی تشریح میں مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ سمع و بصر اور زبان و قلب اور اسی طرح جنسی خواہش کا شر یہ ہے کہ یہ چیزیں احکام خداوندی کے خلاف استعمال ہوں، جس کا انجام اللہ کا غضب اور اس کا عذاب ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس شر سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے اور اس کی پناہ مانگی جائے۔ وہی اگر بچائے گا تو بندہ بچ سکے گا ورنہ مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔

آیئے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ ہم کو اخلاقی اور جسمانی آفات سے محفوظ رکھیں اور ہمیں پاکیزہ نظر، پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ عمل سے نوازیں۔] (دعوات عبدیت جلد دوم کا آٹھواں وعظ، ترتیب و تدوین: عبدالرشید صدیقی)

☆ یہ عبارت مرتب کی طرف سے مضمون کی مناسبت سے اضافہ کی گئی ہے۔

تاتاریوں میں اشاعت اسلام

ابوالحسن علی ندوی

تاریخ کے طالب علموں کے لیے یہ مطالعہ کا بہت دلچسپ اور اہم موضوع ہے کہ تاتاری، جنھوں نے مسلمانوں کے تمام علاقے تاخت و تاراج کر دیے تھے، کس طرح اسلام کی پرکشش تعلیمات کے اسیر ہو گئے۔ جدید دور کے تناظر میں، جبکہ مغرب کی فاتح اور غالب تہذیب امت مسلمہ سے نبرد آزما ہے، اس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ شاید ہم مغرب کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں زیر نہیں کر سکتے لیکن یقیناً ایسی حکمت عملی اختیار کر سکتے ہیں کہ دین اسلام کے لیے ان کے دلوں کو فتح کر لیں۔ ہم تاتاریوں کے قبول اسلام پر' تاریخ دعوت و عزیمت سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تحریر نقل کر رہے ہیں۔ یہ دراصل اس موضوع پر تحقیق کی دعوت ہے تاکہ اس تاریخ ساز عمل کے تمام پہلو اور گوشے سامنے آ سکیں۔ ایک مطالعے کے مطابق اس میں ان مسلمان بہنوں کا بھی اہم کردار ہے جو فتح کے بعد تاتاریوں کے گھرانوں میں پہنچیں۔ (مدیر)

قریب تھا کہ سارا عالم اسلام [تاتاریوں کے] اس سیلاب بلا میں بہ جائے اور اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جائے کہ دفعتاً تاتاریوں میں اشاعت اسلام شروع ہو گئی اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور مسلمان بادشاہ نہ کر سکے، وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔

اس ناقابل تسخیر قوم کا اسلام سے مسخر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے مفتوح ہو جانا، تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے ہے۔ درحقیقت تاتاریوں کا ایک سال کے عرصے میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا اور عالم اسلام کو بزور شمشیر فتح کر لینا، اتنا عجیب واقعہ نہیں، اس لیے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں، کمزوریوں کا شکار تھا جو بالعموم تہذیب و تمدن کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خون خوار و خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معما یہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں یہ نیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ

بگوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی اور سیاسی طاقت کھو چکا تھا اور جس کے پیروؤں کو تاتاری سخت ذلت اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پروفیسر ٹی۔ڈبلیو۔ آرنلڈ اپنی مشہور کتاب' دعوت اسلام (Preaching of Islam) میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا' اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے۔۔۔۔۔۔ مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا' مسلمان کرلیا۔ یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلات پیش آئیں کیونکہ دو مذہب اس کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں۔ وہ حالت بھی عجیب و غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی' جس وقت بدھ مت' عیسائیت اور اسلام اس کوشش میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے ان تینوں بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا' اپنا مطیع بنائیں" (دعوت اسلام' ترجمہ مولوی عنایت اللہ' ص ۲۴۰-۲۴۱)۔

"اسلام کے لیے ایسے وقت میں بدھ مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچاکر اپنا پیرو بنانا' ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ مغلوں کے طوفان ہلاکت سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا۔ وہ مشہور و معروف شہر جو ایک زمانے میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے' اکثر جلا کر خاک کر دیے گئے تھے۔ مسلمانوں کے عالم اور فقیہ یا تو قتل کیے گئے' یا ان کو غلام بنایا گیا۔ خاقان مغل جو اسلام کے سوا اور سب مذہبوں پر مہربان تھے' اسلام کے ساتھ شدید درجے کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے۔ چنگیز خاں نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شرع کے مطابق ذبح کریں' ان کو قتل کر دیا جائے۔ اسی حکم کو قوبلائی خان نے اپنے زمانے میں از سرنو جاری کیا اور اس کی پیروی کے لیے مخبر اور مخبروں کے لیے انعام مقرر کیے۔ اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت آزار پہنچائے گئے۔ مفلسوں نے اس موقع پر دولت جمع کرلی اور غلاموں نے آزاد ہونے کے لیے آقاؤں پر ذبیحہ کا الزام لگایا۔ باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں' انھی مسلمانوں کا مذہب قبول کیا' جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا" (دعوت اسلام' ص ۲۴۵-۲۴۶)۔

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے' اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات بہت کم ملتی ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا' ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے۔ وہ مخلصین جنھوں نے اس خون آشام تاتاری قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا' ان میں سے بہت کم لوگوں کا نام

دنیا کو معلوم ہے مگر ان کا یہ کارنامہ کسی اسلامی کارنامے سے کم نہیں۔ ان کا یہ احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی تولیت میں دے دیا، جو خدائے واحد کی پرستار اور رحمۃ للعالمینؐ کے دین کی علم بردار تھی۔

چنگیز خان کے انتقال کے بعد، سلطنت اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی۔ ان چاروں شاخوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی اور تاتاری خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ اور اثر سے تاتاری قوم مسلمان ہونا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی۔ پروفیسر آرنلڈ نے، دعوت اسلام میں، اس کے جستہ جستہ واقعات لکھے ہیں۔ چنگیز خان کے بڑے بیٹے، جوجی خان کی شاخ میں جو سلطنت کے مغربی حصے سیراوادرا پر حکمراں تھی، اشاعت اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:

"مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برکہ خان تھا، جو ۱۲۵۶ سے ۱۲۶۵ تک سیراوادرا کا خان رہا۔ اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک دن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آتا تھا۔ اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برکہ خان الگ لے گیا اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات ان سے کیے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام و ارکان اس خوبی سے بیان کیے کہ سیراوادرا کے خان کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا اور وہ اسلام لے آیا۔ برکہ خان نے اس کا حال اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا اور اس کو بھی اسلام قبول کرنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد برکہ خان نے سلطان مصر، رکن الدین بیبرس سے مصالحت کر لی۔ اس مصالحت کا باعث خود سلطان مصر اس طرح ہوا کہ اس نے سیراوادرا کے دو سو مغلوں کی نہایت خاطر مدارات کی۔ ان مغلوں کا قصہ یہ ہے کہ جب خان سیراوادرا اور ہلاکو خان، فاتح بغداد میں عداوت زیادہ بڑھی، تو یہ دو سو مغل جو ہلاکو خان کی فوج میں بھرتی تھے، بھاگ کر شام کے ملک میں چلے آئے۔ اور یہاں سے وہ بڑے اعزاز کے ساتھ قاہرہ پہنچائے گئے، جہاں دربار مصر سے ان کو اسلام قبول کرنے کی توفیق ملی۔ سلطان رکن الدین نے ان دو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے چند سفیر اور برکہ خان کے نام ایک خط ان کی معرفت روانہ کیا۔ جب یہ لوگ سیراوادرا سے قاہرہ واپس آئے، تو سلطان کو خبر دی کہ برکہ خان کے امیروں کے ہاں اور ایک شہزادی کے ہاں ایک ایک امام اور موذن مقرر ہے اور بچوں کو مکتب میں قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ سلطان سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ہم قاہرہ سے روانہ ہوئے تھے، تو راستے میں برکہ خان کے سفیر ملے، جو سلطان مصر کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچانا چاہتے تھے کہ برکہ خان اور اس کی

رعایا مسلمان ہو گئی ہے۔ غرض جب سلطان رکن الدین اور برکہ خان میں رسم اتحاد پیدا ہوئی، تو سیرادوارا کے بہت سے مغل مصر میں آئے، جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی" (مقریزی، ص ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۷، ۲۰۵، ۲۲۴)۔

تاتاری سلطنت اور خاندان چنگیز خان کی دوسری شاخ، دولت ا-لخانیہ میں، اشاعت اسلام کے متعلق آرنلڈ لکھتا ہے:

"ایران، جہاں ہلاکو خان دولت ا-لخانیہ کا بانی ہوا------ اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی.... ہلاکو خان کا بیٹا تکودار جو اپنے بھائی باقا خان کا جانشین ہوا، دولت ا-لخانیہ کا پہلا بادشاہ تھا جس نے اسلام قبول کیا۔ ایک عہد نویس عیسائی مصنف نے لکھا ہے کہ تکودار کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی۔ بچپن میں اس کو اصطباغ [بپتسمہ] ملا تھا اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا۔ تکودار جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثر صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا، اور جس قدر ہو سکا، اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کرلیں۔ اس غرض کے لیے اس نے انعام و اکرام اور اختیار اور عزت لوگوں کو بخشی، یہاں تک کہ اس کے زمانے میں بہت سے تاتاری مسلمان ہو گئے۔ اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر ذیل کے مراسلے سے بھیجی:

"خدا کی قوت اور قاآن کے اقبال سے، سلطان احمد کا فرمان بادشاہ مصر کے نام۔ بعد تمہید کے واضح ہو کہ خدا نے اپنی عنایت اور ہدایت کی روشنی سے، آغاز نوجوانی کے زمانے میں، ہم کو اپنی الوہیت و وحدانیت کا اقرار کرنے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے اور اپنے دوستوں اور نیک بندوں کی نسبت خوش اعتقاد رہنے کی ہدایت دی تھی۔ وہ جس کسی کو ہدایت پر لانا چاہتا ہے، اس کے دل کو مذہب اسلام قبول کرنے کے لیے کھول دیتا ہے۔ ہم اس وقت سے آج تک، دین کا بول بالا کرنے اور مذہب اسلام اور مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کرنے پر مائل رہے، یہاں تک کہ والد بزرگوار اور برادر بزرگوار کی طرف سے حکمرانی کی نوبت ہم تک آپہنچی۔ خدا نے اپنی مہربانی سے ہماری امیدوں کو پورا کیا اور حکومت و سلطنت ہم کو عنایت کی۔ پھر قربلتائی (کورلتائی) مبارک میں [جس سے وہ مجلس مراد ہے، جس میں تمام بھائی بند اور شہزادے اور بڑے بڑے امیر اور فوج کے سردار مشورہ کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں] سب نے مل کر یہ اقرار کیا کہ ہمارے برادر بزرگ کے حکم سے فوج کشی کو جاری کیا جائے اور ہماری فوجوں میں سے، جن کی کثرت سے زمین باوجود وسیع ہونے کے تنگ ہے، اور جن کی صولت اور ہیبت سے سب کے دل کانپتے اور تھراتے ہیں، ایک جم

غفیر کو اطراف میں روانہ کیا جائے اور یہ فوج کشی ایسے مضبوط ارادے کے ساتھ ہو، جس کے سامنے بلند پہاڑ جھک جائیں، اور سنگ خارا کی چٹانیں نرم پڑ جائیں۔ ہم نے اس مقصد پر غور کیا جس پر ان کے ارادے پختہ اور ان کی رائیں متفق تھیں اور ان سب کا خلاصہ جو معلوم ہوا، وہ اس عام نیکی کے خلاف تھا، جس کے جاری کرنے کا ہم ارادہ رکھتے تھے، جس سے مراد یہ ہے کہ شعار اسلام کو زندہ کیا جائے، جو احکام ہماری طرف سے جاری ہوں، ان سے خونریزی موقوف ہو، دنیا کی مصیبت کم ہو، اور دنیا کے اطراف میں امن و امان کی ہوا چلے۔ تمام شہروں کے حاکم ہماری شفقت اور مہربانی سے آرام پائیں، کیونکہ ہم خدا کی تعظیم کرتے ہیں اور خدا کی مخلوق پر مہربان ہیں۔ اس لیے خدا نے ہمارے دل میں الہام کیا کہ ہم مشتعل آگ کو بجھائیں اور فتنہ و فساد کو فرو کریں اور جن لوگوں نے یہ رائے دی ہے، ان کو اس تدبیر سے مطلع کریں، جس سے دنیا کی بیماریاں اور تکلیفوں کے دور ہونے کی امید ہے، اور جس کو سب سے پہلے عمل میں لانے کی، سب سے آخری علاج سے باز رہنے کی، خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے۔ اس لیے ہم پیکانوں کو جنبش میں لانے اور کمانوں پر چلے چڑھانے میں جلدی نہیں کرتے ہیں اور جب تک حق بات ظاہر نہ ہو، حجت قوی نہ ہو، ہم اس امر کی اجازت نہیں دیتے۔ شیخ الاسلام قدوۃ العارفین کی نصیحت نے، جو امور مذہبی میں ہمارے سب سے بہتر مددگار ہیں، ہمارے اس ارادے کو جو فلاح و بہبود کی خواہشوں پر مبنی ہے اور اس رائے کو جس سے کامیابی کی امید ہے، پختہ اور مصمم کر دیا، چنانچہ ہم نے یہ فرمان جاری کیا، جو ماننے والوں کے لیے خدا کی رحمت اور نہ ماننے والوں کے لیے خدا کا عذاب ہے۔

ہم نے اس فرمان کے ماننے والوں کے لیے قاضی القضاۃ قطب الدین شیرازی اور اتابک بہاء الدین کو جو اس سلطنت کے عمائد ہیں، روانہ کیا ہے، تاکہ لوگوں کو ہمارے طریقے سے واقف کریں اور تمام مسلمانوں کے فائدے کے لیے جو بات ہمارے دل میں پوشیدہ ہے، سب اس سے آگاہ ہوں۔ نیز ان سب لوگوں کو اس بات سے مطلع کریں کہ خدا نے ہم کو بصیرت و ہدایت عطا کی ہے اور اسلام ان تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے، جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں۔ اب تو خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق اور اہل حق کی پیروی کریں...... پس اگر لوگوں کے دل ایسی دلیل کی جستجو میں ہیں جن سے وہ ہم پر بھروسہ کر سکیں، اور ایسی حجت طلب کرتے ہیں جس سے کامیابی کی امید کر سکیں تو وہ ہماری ان تمام فضیلتوں پر نظر ڈالیں، جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہو چکی ہیں۔ کیونکہ ہم نے خدا کی عنایت سے دین کے نشانوں کو بلند کیا ہے اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے، اور شرع محمدیؐ کے قوانین کو بلحاظ ان کی عظمت اور بزرگی

کے عین مقتضائے انصاف پر جاری کیا ہے۔ ہم نے تمام رعیت کے دلوں کو خوش کیا ہے، اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی، ان سب کو یہ کہہ کر معاف کر دیا ہے کہ خدا بھی تمھاری اگلی خطاؤں کو معاف کرے۔

ہم نے مسلمانوں کے اوقاف کی، جن میں مسجدیں، مقبرے اور مدرسے شامل ہیں، اصلاح کی ہے، اور تمام خیرات خانوں اور مہمان سراؤں کو جن کے نشانات مٹ گئے تھے، دوبارہ آباد کیا ہے اور اوقاف کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور اور وقف کرنے والوں کی شرائط کے موافق حق داروں تک پہنچا دیا ہے۔ ہم نے حکم دیا ہے کہ ہمارے حکام حاجیوں کے معاملے کو مہتم بالشان سمجھیں، ان کے لیے سامان سفر مہیا کریں اور جن رستوں سے وہ سفر کرتے ہیں، ان کو آباد و بے خطر رکھیں، اور حاجیوں کے قافلوں کو باآرام تمام روانہ کریں۔ ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمدورفت رکھتے ہیں، پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنے طریقے سے جس طرح چاہیں سفر کریں۔ فوج، قراغول اور شحنوں کو جو ملک کے اطراف میں مقرر ہیں، سخت ممانعت کی ہے کہ وہ سوداگروں کی آمدورفت میں کسی طرح کی مزاحمت کریں..... تاکہ شہر اور ملک آباد ہوں، فتنے اور فساد فرو ہوں نیز تلواریں میان میں رہیں، اور تمام باشندے آرام و آسایش سے زندگی بسر کریں اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے نکل جائیں" (وصاف، ص ۲۳۱، ۲۳۴)۔

تاریخ مغلیہ کے ناظرین کو ان صدہا مظالم اور متواتر کشت و خون کے ہنگاموں کو پڑھنے کے بعد جو مغل اور تاتاریوں نے برپا کیے، اس فرمان کے مطالعہ کرنے سے بہت راحت ہوئی ہوگی اور تعجب ہوا ہوگا کہ ایک مغل فرمانروا کی زبان سے بھی اس قدر فیاضی اور انسانی ہمدردی کے خیالات ادا ہوئے (دعوت اسلامی، ص ۲۴۸، ۲۵۱)۔

۱۲۸۴ میں تکودار احمد کے خلاف ایک بغاوت برپا ہوئی، جس کا سرغنہ ارغون خان تھا۔ اس نے تکودار کو قتل کیا اور خود مالک تخت و تاج بن گیا۔ ارغون کے عہد حکومت میں (۱۲۸۴-۱۲۹۱)، جو چند سال تک جاری رہا، عیسائیوں پر پھر سلطنت کی طرف سے مہربانی ہوئی اور مسلمانوں کو سختیاں اٹھانی پڑیں، اور سرکاری عہدوں اور نوکریوں سے وہ برطرف کر دیے گئے (دے مطبین، ج ۳، ص ۲۶۳)۔ ۱۲۹۵ تک تکودار کے جانشین اپنے قدیم مذہب شلمان کے پیرو رہے، لیکن ۱۲۹۵ میں ان کا ساتواں بادشاہ غازان جو خاندان ایلخانیہ کا سب سے زیادہ بارعب اور پرسطوت بادشاہ ہوا، مسلمان ہو گیا اور اس نے اسلام کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا۔

مسلمان ہونے سے پہلے سلطان غازان کی تعلیم و تربیت بدھ مذہب پر ہوئی تھی اور خراسان میں اس بادشاہ نے بدھوں کے لیے مندر تعمیر کر دیے تھے۔ بدھ مذہب کے عالموں کی صحبت سے وہ بہت

خوش ہوتا تھا اور یہ لوگ جس وقت دولت مغلیہ کو عروج ہوا تھا' ایران میں کثرت سے چلے آئے تھے۔ سلطان غازان کو مختلف مذہبوں کی تحقیق و تفتیش کا بڑا شوق تھا اور ہر مذہب کے عالموں سے وہ مذہبی مباحثہ کرتا تھا۔ غازان کا وزیر اور اس کے عہد کا مورخ حکیم رشید الدین تھا' جس کا یہ خیال غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غازان نے سچی نیت اور عقیدہ سے مسلمان ہوا اور اپنے تمام زمانہ بادشاہی میں وہ اسلام کا نہایت پابند رہا" (دعوت اسلام' ص ۲۵۳)۔

مورخ ابن کثیر نے بھی غازان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۴ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے' اور ان کے اور دوسرے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سرا نیک دل مسلمان ترک امیر' توزون کے سر ہے' جن کی تلقین اور سعی سے تاتاری سلطان نے اسلام قبول کیا۔ ابن کثیر ۶۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں:

"اس سال چنگیز خان کا پڑپوتا' قازان بن ارغون بن ابغابن تولی بن چنگیز خان' تاتاریوں کا بادشاہ ہوا' اور امیر توزون رحمتہ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف بہ سلام ہوا اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے۔ جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا' اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سروں پر نچھاور کیے گئے۔ اس نے اپنا نام محمود رکھا' جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی' بہت سے مندر اور گرجے گرا دیے گئے' اور ان پر جزیہ مقرر کیا۔ بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں' اور انصاف کیا گیا' لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں اور ہیاکل دیکھے' اور اللہ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا" (البدایہ والنہایہ' ج ۱۳' ص ۳۴۰)۔

آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۱۳۰۴ میں غازان کا بھائی سلطان بن محمد خدا بندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا۔ اس سلطان کی ماں عیسائی تھی' بچپن میں اس کی تعلیم و تربیت بھی عیسوی طریقہ سے ہوئی تھی اور نکولس کے نام سے اس نے اصطباغ پایا تھا' لیکن ماں کے مرنے پر وہ اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ نکولس خان یعنی سلطان خدابندہ کے مسلمان ہونے سے مغلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا' غرض اس زمانے سے قلمرو ایلخانیہ میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آ گیا (دعوت اسلام' ص ۲۵۴)۔

اس خاندان کی تیسری شاخ میں' جو بلاد متوسطہ پر قابض تھی' اور جس کا بانی چغتائی بن چنگیز خان تھا' اشاعت اسلام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے' آرنلڈ لکھتا ہے:

"بلاد متوسطہ میں جو چغتائی ابن چنگیز خاں اور اس کی اولاد کے حصے میں آئے تھے' دعوت اسلام کے حالات کا بہت کم پتا چلتا ہے' اس سلسلے میں پہلا بادشاہ جس کو نور اسلام کی برکت ملی' وہ براق خان تھا جو چغتائی خان کا پڑپوتا تھا' اور جس نے تخت نشین ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان

غیاث الدین (۱۲۶۶-۱۲۷۰) اپنا نام رکھا۔ لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی، چونکہ براق خان کے مرنے کے بعد جو مغل مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا اور چودھویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح نہ ہو سکی۔ البتہ طرمشرین خاں جس نے ۱۳۲۲ سے ۱۳۳۰ تک حکومت کی، جس وقت مسلمان ہوا، تو چغتائیہ مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا، اور جب ایک دفعہ انھوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا، تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا جو حریف مقابل تھے، یقینی امر نہ تھا، کیونکہ طرمشرین کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیے، اور جب تک کاشغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم و ضعف سے خود مختار ہو گئی تھی، اسلام کی حمایت کو نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی۔ سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام، تغلق تیمور خاں (۱۳۴۷-۱۳۶۳) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کاشغر میں آئے، اور انھوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا۔ شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گزر ہوا۔ بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصے کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے۔ شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں، اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں، جس پر چلنے کی ممانعت ہے۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں، تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے۔ شیخ نے کہا کہ سچ ہے، اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے۔ یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا اور حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں، تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے، اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمھارا کیا مطلب ہے؟ یہ سن کر شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا، اب موم کی طرح نرم ہو گیا۔ شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا: "اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا، تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لا سکوں گا، اس لیے کچھ عرصے کے لیے تم سکوت کرو۔ جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک بنوں، تو اس وقت تم میرے پاس آنا۔

چغتائیہ سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عمل داریوں کو شامل کر کے پھر قلمرو چغتائیہ کی مثل ایک سلطنت قائم کر دے۔ اس عرصے میں شیخ جمال الدینؒ اپنے وطن کو چلے گئے اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا وقت قریب آیا، تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ ہو گا، تم اس وقت اس کے پاس جانا، اور میرا سلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ چند سال کے بعد تیمور تغلق نے باپ کا تخت حاصل کر لیا، تو ایک دن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت کو پوری کرے لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضوری نہ ہوئی۔ آخرکار اس نے مجبور ہو کر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تغلق کے خیمے کے قریب اذان کہنی شروع کی۔ تغلق کی جب نیند خراب ہوئی تو غصہ آیا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تغلق کو سنایا۔ تغلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا۔ اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی، اور اس کے زمانے میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہو گیا، جو چغتائی ابن چنگیز خاں کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے" (دعوت اسلام ص ۲۵۶)۔

چنگیز خان کی چوتھی شاخ کے متعلق (جس کا بانی اوگتائی خاں تھا، اور جس میں منگو خاں اور قوبلائی خاں جیسے نامور فرمانروا گزرے ہیں، اور جو تاتاری سلطنت عظمیٰ کے مشرقی حصے پر قابض تھی)۔ آرنلڈ لکھتا ہے:

"تمام سلطنت مغلیہ میں ہر جگہ ایسے مسلمان موجود تھے، جو منکرین کو خفیہ طور پر مسلمان کر لیتے تھے۔ اوگتائی خاں (۱۲۲۹-۱۲۴۱) کے عہد میں حاکم ایران کو گزنای کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بدھ مذہب کا پیرو تھا، پھر اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا۔ تیمور خاں کے زمانے میں (۱۲۲۹-۱۲۴۱) خان انندا نے جو قوبلائی خان کا پوتا تھا، اور چین میں صوبہ کانسوہ کا حاکم تھا، اسلام قبول کیا اور تانگوت میں اس نے بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا، بلکہ جو فوج اس کے تحت تھی، اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہو گئے۔ تیمور خان نے انندا خاں کو اپنے دربار میں بلایا اور کوشش کی کہ انندا خاں اسلام چھوڑ کر بدھ مذہب قبول کرے، لیکن اس نے انکار کیا، اور قید میں بھیج دیا گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد انندا خاں قید سے رہا کر دیا گیا، کیونکہ تانگوت کی رعایا جس کو اپنے حاکم کے ساتھ بہت الفت تھی، بغاوت پر آمادہ ہو چلی تھی" (دہوسن، توم ۲، ص ۵۳۲-۵۳۳)۔

غرض اس طرح پوری تاتاری قوم جس نے پورے عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا تھا اور جس کے سامنے کوئی اسلامی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند برس کے عرصے میں اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی اور اسلام

نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دام محبت میں اسیر کرنے کی عجیب و غریب قدرت حاصل ہے۔ تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے، بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، عالم، فقیہ اور بڑے بڑے باخدا درویش پیدا ہوئے اور انہوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اہم گزارش: ترجمان القرآن میں اشتہار دینے والے اداروں یا افراد سے معاملات میں کوئی نقصان ہو تو ترجمان القرآن کے نمائندے اس کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ قارئین کو چاہیے کہ کوئی معاملہ کرنے سے پہلے تحقیقات کریں اور اپنی ذمہ داری پر معاملہ کریں۔ (مدیر انتظامی)

کام ۔ منصوبے کے مطابق

محمد وسیم خان راؤ

منصوبہ کیا ہے؟

منصوبہ منزل پر پہنچنے کا ذریعہ ہے' جو ماضی میں پیش آنے والے واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی پیش بینی کرتے ہوئے' ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کراتا ہے جس پر عمل کر کے منزل پر پہنچنے کی راہ سہل ہو سکے---- یا دوسرے الفاظ میں:

مختلف حقائق اور عوامل کا ایسا مجموعہ جو بامقصد اور صحیح رخ پر ہو۔ منصوبہ خواہشات و تمناؤں یا پروگراموں کی ایک فہرست مرتب کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ حالات کا تجزیہ کرنے' افراد کی ذمہ داریاں لگانے' اطلاعات و ہدایات جاری کرنے' راہ نمائی و متحرک کرنے اور افراد کو نظم میں رکھتے ہوئے' مقصد کی جانب پیش قدمی کرنے کا نام ہے۔

منصوبہ بندی کے تین درجے ہیں:

طویل منصوبہ بندی: یہ منصوبہ بندی عموماً تین سے دس سال تک کے عرصے کے لیے ہوتی ہے۔ اس ضمن میں' تنظیم و تحریک عوامی' سیاسی' قانونی و طویل مدت کے پروگرام' مثلاً اداروں کا قیام' افراد کو مختلف اداروں اور شعبہ جات میں کھپانے اور مستقبل کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی حکمت عملی تیار کرتی ہے۔

درمیانی مدت کی منصوبہ بندی: یہ منصوبہ بندی عموماً ایک سے تین سال تک کے عرصے پر محیط ہوتی ہے۔ یہ دعوت کے اہداف' مختلف مسائل اور ایشوز کا تعین کرنے' کوئی اہم چیلنج مثلاً الیکشن درپیش ہو تو اس کے بارے میں کی جاتی ہے۔

طریق عمل کی منصوبہ بندی: یہ عموماً ایک ماہ کے عرصے کے لیے ہوتی ہے۔ اس کا مقصد سالانہ منصوبے کو سامنے رکھتے ہوئے پروگراموں کے بارے میں تفصیل و جزئیات طے کرنا ہوتا ہے۔

منصوبہ بنانے سے قبل چند سوالات: منصوبہ عمل بنانے سے قبل ہمیں چند سوالات کے جوابات حاصل کرنا چاہییں۔ یہ جوابات جس قدر مکمل اور واضح ہوں گے' اسی قدر منصوبہ قابل عمل اور شفاف ہو گا۔

۱- **ہم کیا چاہتے ہیں؟** تنظیم کو اپنے مقصد کے بارے میں بالکل صاف اور واضح ہونا چاہیے- یہ مقصد و نصب العین ہمیشہ بالائی نظم سے لے کر نیچے تک کے کارکن کے ذہن میں ایک ہی جیسے الفاظ کی صورت میں موجود ہونا چاہیے- جدید دور میں کاروباری' ملکی و بین الاقوامی ادارے بھی Mission Statement کی صورت میں اپنے کارکنان کو ایک نصب العین دیتے ہیں- آپ کے لیے' منصوبہ بنانے سے قبل یہ دہرانا ضروری ہے کہ آپ کی تنظیم کا مقصد و نصب العین اور اس کی تشریح کیا ہے؟

۲- **ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہماری منزل کیا ہے؟** اس نکتے کی اہمیت بنیادی پتھر کی سی ہے- یہ تجزیہ جتنا موثر اور جامع ہو گا' اسی قدر منصوبہ قابل عمل اور حالات سے قریب تر ہو گا-

اس تجزیے میں' سب سے پہلے ہمارے پاس جو سرمایہ ہے' اس کا جائزہ لینا چاہیے- ہمارا سب سے اہم سرمایہ--- ہماری افرادی قوت ہے- اس کا تجزیہ ہر حلقے' ذیلی حلقے اور مقام میں لازماً ہونا چاہیے- اس تجزیے کے ضمن میں نظم کے ذمہ دار اپنے تمام ارکان سے انفرادی ملاقاتوں کا اہتمام کریں اور ان سے مختلف انفرادی معلومات حاصل کریں اور ان کی قوت کار اور صلاحیت کا صحیح اندازہ لگائیں- اس طرح ایک ذمہ دار کے سامنے تصویر واضح ہو جائے گی کہ ہمارا کارکن کس اسٹیج پر ہے' اس کے اندر کیا خوبیاں ہیں اور ان خوبیوں میں کس طرح اضافہ کیا جا سکتا ہے اور کیا خامیاں ہیں اور ان خامیوں کو کم کرنے کے لیے کیا سبیل اختیار کرنی ہو گی- یہ سوال بظاہر تو بڑا آسان ہے لیکن اگر اس سوال کا حقیقی حل کسی امیریا ناظم کے پاس آجائے تو مشکلات آسان ہو جائیں گی- اس پر ہمیشہ توجہ رہنا چاہیے کیونکہ افراد سازی' وہ اہم کام ہے جس کی بنیاد پر انبیا علیہم السلام نے معاشروں کو تبدیل کیا- جتنے اچھے اور کار آمد افراد کا سرمایہ تنظیم کو حاصل رہے گا' اسی قدر تیزی سے تنظیم اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی کرے گی-

تنظیم و تحریک کے طور پر یہ سوالات ہمارے پیش نظر ہونے چاہییں ا- ہمیں کیا کرنا ہے؟ ۲- کس طرح کرنا ہے؟ ۳- کون سے وسائل درکار ہوں گے؟ ۴- یہ وسائل کہاں سے فراہم ہوں گے؟ ۵- ہماری دعوت کی صورت حال کیا ہے؟ کیا ہونی چاہیے تھی؟ ۶- ہماری دعوت کے مخاطبین اس وقت کون ہیں؟ اور کون اس کے علاوہ ہونا چاہییں ۷- کتنے فی صد افراد (حضرات و خواتین) تک دعوت براہ راست پہنچ چکی ہے؟ ۸- ہمارے ممبرز کتنے ہیں اور ان سے ہمارا رابطہ کیسا ہے؟ ۹- کن امور میں ہم پیچھے ہیں؟ ۱۰- کن چیزوں میں ہمیں برتری حاصل ہے؟ ۱۱- ہمارے حلیف و حریف کون کون ہیں اور ان کے وسائل' قوت و اثرات کی نوعیت کیا ہے؟

۳- **ہمیں کیا کرنا ہے؟** تنظیم کے مقاصد اور اس کی موجودہ صورت حال کو جاننے کے بعد ان حالات کا جاننا بہت ضروری ہے' جن میں کام کرنا ہو اور جن کو سامنے رکھتے ہوئے منصوبہ بنانا مقصود ہو-

کیونکہ حالات کسی بھی تنظیم کو کامیاب یا ناکام کر سکتے ہیں۔

حالات کے تجزیے میں ملک، شہر یا گاؤں کی اقتصادی، معاشرتی، سیاسی و مذہبی صورت حال سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مخالفین، دیگر سیاسی گروہ، عوام کے مختلف طبقات، حکومتی اداروں اور دیگر اداروں کے مختلف نت نئے ہتھکنڈوں سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔

حالات کا صحیح تجزیہ ہمیں آنے والی تبدیلیوں سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے مقابلے کے لیے تیار کرتا ہے۔ اس تجزیے کے صحیح نتائج ہمیں ایک خاص وقت میں، خاص تبدیلی سے باخبر رکھنے میں معاون ہوں گے۔ اگر ماحول و حالات میں تبدیلی کا احساس تنظیم کو دیر سے ہو تو تنظیم حالات سے فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہتی اور اس کے حریف آگے بڑھ کر کسی بھی مسئلے کو اپنی گرفت میں لے کر حالات کو اپنے زیر اثر کر لیتے ہیں۔ زندہ تحریکوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا ہاتھ حالات کی نبض پر ہوتا ہے اور اسی کے مطابق وہ راہیں تجویز کرتی ہیں۔

موجودہ صورت حال کا تجزیہ آسان ہے۔ لیکن مستقبل کبھی صاف نہیں ہوتا۔ مستقبل یعنی ایک مسلسل عمل ہے۔ مستقبل کی مشکلات و مواقع کا اندازہ کرنا، منصوبہ بندی کا ایک اہم جز ہے۔

۴- **ہم کیا کر سکتے ہیں؟** تنظیم کے لیے وسائل کی اہمیت واضح ہے۔ وسائل کی فراہمی یا عدم فراہمی تنظیم کی کامیابی یا ناکامی پر منتج ہوتی ہے۔ وسائل کی فراہمی کے حوالے سے سوال یہ نہیں ہے کہ "ہم اچھا کام کر رہے ہیں یا خراب"۔ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ "ہم دوسروں سے بہتر کام کر رہے ہیں یا خراب"۔

وسائل کے تجزیے کے چار بنیادی نکات ہیں: مالیاتی، افرادی، تکنیکی اور اوقات۔

مالیات کے ضمن میں اہم بات آمدنی و اخراجات کا تخمینہ لگانا، اس میں مسلسل اضافے کی کوشش کرنا اور اس کو جاری منصوبہ عمل کے مطابق رکھنا ہے۔ جب تک منصوبے کے مطابق مالیاتی بجٹ نہیں بنے گا، منصوبہ عمل کے کام وسائل کی عدم فراہمی کی بنا پر نہ ہو سکیں گے۔

افرادی قوت کسی بھی تنظیم کا سب سے اہم سرمایہ ہے۔ افرادی قوت کی صلاحیت و قابلیت دیگر تمام وسائل کی کمی کو پورا کر سکتی ہے۔ اگر اہل افراد ہوں تو مال کی کمی بھی پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر افراد کی ٹیم نااہل ہو تو بڑے سے بڑا سرمایہ بھی ڈوب سکتا ہے۔ افراد سازی ایک ایسا مشکل کام ہے جس میں بڑی محنت، توجہ و حکمت درکار ہوتی ہے۔ افرادی قوت کے تجزیے سے آپ اس بات کے قابل ہو سکیں گے کہ کن حالات و مواقع میں، کون سے افراد کو استعمال کریں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تمام افراد ایک جیسی صلاحیتوں کے حامل نہیں ہوتے۔ کچھ افراد کسی خاص شعبے میں زیادہ کارآمد ہوں گے تو دوسرے شعبوں میں کمزور ہوں گے۔ تحریک کا کام کمزوروں کو قوی کرنا اور ان کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرنا ہے۔۔۔۔

جہاں تنظیم کی منصوبہ بندی ضروری ہے، وہاں افراد کی ذاتی منصوبہ بندی بھی اہمیت کی حامل ہے۔ تنظیم کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہر کارکن ماہانہ اور سالانہ بنیادوں پر اپنی ذاتی منصوبہ بندی کرے۔

تکنیکی تجزیے میں (اور یہ صوبہ اور مرکز کی سطح پر ممکن ہے) تحریک کو اس بات کا احساس کرنا ہو گا کہ باطل قوتیں بڑے بڑے اداروں کی صورت میں اگلے دس اور بیس سال کے بارے میں پیش بندی کر رہی ہیں۔ ان کو ذرائع ابلاغ کی وہ قوت میسر ہے کہ جس خبر کی اشاعت چاہتے ہیں، اسے پوری دنیا میں پھیلا دیتے ہیں اور جس کو پس پردہ رکھنا چاہیں، اس کی ہوا نہیں لگنے دیتے۔ ہزاروں رسالے سیکڑوں ٹی وی چینل اور سیٹلائیٹ ان قوتوں کے زیر اثر ہیں جو ان کی ثقافت اور نقطہ نظر کو دن رات پھیلانے میں مشغول ہیں۔

اس کے علاوہ مالیاتی ادارے، کرنسی کا کاروبار، بڑی بڑی مشینیں، اسلحہ کے انبار اور ان جیسی سیکڑوں چیزیں باطل قوتوں کے زیر اثر ہیں۔ ہمیں اپنے منصوبے میں اس صورت حال کے تدارک کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور سوچنا چاہیے۔

وسائل کے تجزیے کا آخری نکتہ "وقت" ہے۔ انسان کو بھی ایک خاص مہلت عمل دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے اور جو فرد یا تنظیم اوقات سے صحیح فائدہ اٹھا کر اپنے لیے توشۂ آخرت جمع کرے، وہ کامیاب ہے۔ ورنہ وقت گزرنے کے بعد صرف پچھتاوا انسان کا مقدر بن جاتا ہے۔ ہر فرد اور تنظیم کو اپنے وقت کا محاسبہ ضرور کرنا چاہیے۔ کسی بھی قسم کی مہم درپیش ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے لیے کتنا وقت درکار ہو گا اور کون کون سے کارکنان کتنا کتنا وقت دیں گے ـــــ وقت کا صحیح اندازہ بہت سے ان کاموں سے چھٹکارا دلا دے گا جن کو ہم تنظیم کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔

وقت ایسی چیز ہے جس کو نہ جمع کیا جا سکتا ہے نہ منتقل اور نہ ہی قرض لیا یا دیا جا سکتا ہے۔ ہر فرد کے پاس ۲۴ گھنٹے ہوتے ہیں۔ کچھ افراد ان ۲۴ گھنٹوں میں بڑے بڑے امور انجام دے لیتے ہیں اور کچھ سونے، جاگنے اور ادھر ادھر جانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

۵- جو کچھ کر سکتے ہیں اس کے لیے کیا کرنا ہے؟ تنظیم کے تجزیے، حالات کے تجزیے اور وسائل کے تجزیے کے بعد (۲، ۳، ۴) ہم پانچویں قدم پر آتے ہیں۔ یہ ان حالات و واقعات (سیاسی، مذہبی، اقتصادی، معاشرتی اور لسانی) کا تجزیہ ہے جن سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں یا جو ہمارے ممد و معاون ہو سکتے ہیں یا وہ مشکلات جو مندرجہ بالا حالات کی بنا پر ہمارے سامنے پیش آ سکتی ہیں۔

ہر مقام کے لحاظ سے تنظیم و تحریک کو اس بارے میں سوچ و بچار ضرور کرنا چاہیے کہ مقام کے لحاظ سے ایسے خاص خاص کون سے پہلو ہیں جن کی بنیاد پر ہماری دعوت زیادہ تیزی سے پھیل سکتی ہے اور افراد ہماری بات سننے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں یعنی موافق و مخالف دونوں صورت حال کا تجزیہ ہی ہماری سمت کو درست رکھنے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

۶- جو کچھ ہم کر رہے ہیں' کیا ہمیں وہ وہاں پہنچا سکتا ہے جو ہمارے پیش نظر ہے؟ یہ مرحلہ مسلسل جانچنے کا مرحلہ ہے اور اپنے آپ میں جھانکنے کا بھی ہے کہ آیا ہم نے جو منصوبہ بنایا تھا اس پر اس وقت تک کتنا عمل ہوا ہے اور آیا جو عمل ہوا ہے وہ ہمارے معیار و توقعات کے مطابق ہے۔ اور اگر عمل نہیں ہوا ہے تو اس کی وجوہات کیا ہیں؟ اس کام کو اپنے رجسٹر و ڈائری میں ماہانہ چیک کیا جا سکتا ہے کہ ہماری کارکردگی اور منصوبے میں کہاں اور کتنا فرق ہے۔ اگر ہماری کارکردگی اور منصوبہ بندی میں فرق ہے تو فوری طور پر وقت ضائع کیے بغیر یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس کی کیا وجوہات ہیں اور ان وجوہات و مشکلات کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

۷- ہم کیا کریں جو ہمیں مقصد پر پہنچا دے؟ اگر کارکردگی منصوبہ بندی کے مطابق نہیں ہے تو آپ کا اگلا قدم متبادل ذرائع کی تلاش ہونا چاہیے۔ ایسے کون کون سے مزید ذرائع ہیں جو منصوبے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس مرحلے پر' کون سے سلگتے ہوئے مسائل ہیں' ملک کی صورت حال میں کیا ڈرامائی تبدیلی آئی ہے' سیلاب' زلزلہ یا قدرتی آفات میں ہم کو کیا کرنا ہے' یہ تمام عوامل منصوبہ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ گویا ہم وہ تمام چیزیں حاصل نہیں کر سکتے جن کی ہم خواہش کرتے ہیں۔ اس لیے متبادل راستوں کو کھلا رکھنا چاہیے۔

۸- جو طے کیا اس پر عمل درآمد کرو! عمل درآمد کا مرحلہ تنظیموں و تحریکوں کے لیے ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر ہمارے ملک کے حالات' جہاں بے یقینی کی کیفیت ہمیشہ طاری رہتی ہے' منصوبے پر عمل کے لیے بڑی رکاوٹ بنتے ہیں۔ منصوبہ چاہے کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو' اس وقت تک کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جب تک اس کو عمل کے میدان کی بھٹی میں پرکھا نہ جائے۔ منصوبے پر عمل درآمد کے لیے اس کو سہ ماہی یا ماہانہ بنیاد پر مختصر مدت کے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ عمل درآمد و کنٹرول میں آسانی رہے۔

۹- جو کچھ ہم کر رہے ہیں کیا وہ منصوبے کے مطابق ہے؟ امیر یا ناظم کا سب سے اہم کام منصوبے کے تمام حصوں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کا ہے۔ کیونکہ اگر تنظیم کا ایک شعبہ تنزل کی طرف جائے گا تو لامحالہ اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑے گا۔

اس ضمن میں دو سوالات بڑے اہم ہیں: ۱- کیا ہماری حکمت عملی منصوبے کے مطابق ہے؟ ۲- کیا حکمت عملی مقرر کردہ نتائج دے رہی ہے؟

وہی ناظمین جن کی معلومات تازہ ہوتی ہیں اور ہر دم باخبر ہوتے ہیں' وہی حالات و مقاصد کے لحاظ سے منصوبے پر عمل درآمد کراتے ہیں' اور کامیاب رہتے ہیں۔

مطالعہ کتاب

"ثبوت حاضر ہیں": ایک مطالعہ

رفیع الدین ہاشمی

علامہ اقبالؒ نے ۲۱ جون ۱۹۳۶ کو پنڈت نہرو کے نام ایک خط میں، قادیانیوں کو اسلام اور ہندستان کا غدار قرار دیا تھا۔ ان کے الفاظ تھے:

I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and India.

(میرا ذہن اس بارے میں ہر شبہے سے پاک ہے کہ احمدی، اسلام اور ہندستان، دونوں کے غدار ہیں)۔

اور پھر اسی زمانے میں اقبال نے مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو امت مسلمہ سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔۔۔ تو بہ ظاہر یہ مطالبہ، انتہا پسندانہ اور علامہ اقبال کے دھیمے مزاج، نرم خو طبیعت اور وضع داری کے خلاف محسوس ہوتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ، ایک گہری تاریخی اور سیاسی بصیرت سے بھی نوازا تھا۔ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ مرزا غلام احمد کا دعویٰ نبوت، اسلام کی جڑوں پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے، چنانچہ انھوں نے قادیانیوں کی اصلیت کے بارے میں لکھا:

"ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیاے اسلام کے متعلق، ان کے رویے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)، مسلمانان کے قیام نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیاے اسلام کافر ہے۔۔۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں"۔ (حرف اقبال، ترجمہ: لطیف احمد شروانی، اسلام آباد، ۱۹۸۴، ص ۱۱۷-۱۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے قادیانیت پر جو کچھ لکھا، اور جس بصیرت کے ساتھ اس کا تجزیہ کر کے

اس کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا' وہ ان کی دکھتی رگوں کو چھیڑنے کے مترادف تھا---- ایک تو علامہ اقبال کی شخصیت' دوسرے ایسی "ضرب کلیم"---- قادیانی اس چوٹ کو آج تک نہیں بھولے۔ اس چوٹ کی دکھن' وہ اس لیے بھی محسوس کرتے ہیں کہ ۱۹۷۴ء میں' اسلامی جمہوریہ پاکستان کی پارلیمنٹ نے انھیں غیر مسلم اقلیت قرار دے کر' علامہ اقبال کی تجویز یا مطالبے پر صاد کیا۔ اقبال نے ۴۰ سال پہلے قادیانیت کا جو تجزیہ کیا تھا' اس کا علمی جواب تو قادیانیوں سے آج تک نہیں بن پڑا۔ مگر وہ علامہ کو کسی نہ کسی حوالے سے بدنام و رسوا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریک انہدام اقبال کا دائرہ' اب پاکستان سے باہر بھارت اور یورپ خصوصاً برطانیہ تک وسیع ہو رہا ہے۔ مگر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ سردست قادیانیت کی اصلیت اور ان کے عزائم کے بارے میں ایک تازہ کتاب' "ثبوت حاضر ہیں" کا تعارف کرانا مقصود ہے۔

کسی بھی شخص کی تصانیف' اس کی شخصیت کی آئینہ دار اور اس کے خیالات و افکار کی ترجمان ہوتی ہیں۔ اس لیے مذاہب اور تحریکیں اپنی بانی شخصیتوں اور اکابر کی تحریریں بار بار شائع کرتی اور انھیں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کرتی ہیں مگر قادیانی مرزا صاحب کی تصانیف و ملفوظات کو چھاپنے کے بجائے چھپاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بیشتر تحریریں لغویت' نامعقولیت' کذب و افترا' عجیب و غریب تضادات اور مضحکہ خیز "الہامات" کا مجموعہ ہیں۔

قادیانیوں نے ایک مہم کے تحت مرزا غلام احمد کی کتابیں معدوم کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ خاصی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ جہاں بھی مرزا کی کسی کتاب کا سراغ ملے' وہ اسے حاصل کر کے ضائع کر دیتے ہیں۔ معروف دانش ور' معلم اور اقبال شناس پروفیسر محمد منور راوی ہیں کہ وہ وقتاً فوقتاً حضرت مولانا محمد شفیع مرحوم (مہتمم مدرسہ سراج العلوم سرگودھا) کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک شخص مولانا کے ہاں آتا تھا اور ان سے عقیدت و نیاز مندی ظاہر کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار قادیانیوں کے بارے میں غم و غصے اور اضطراب کا اظہار بھی کرتا۔ رفتہ رفتہ اس نے حضرت صاحب کے حلقے میں اعتبار و رسوخ حاصل کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ مدرسہ سراج العلوم کے کتب خانے میں قادیانیت کی اصل کتابیں موجود ہیں۔ ایک روز اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مولانا کو قائل کر لیا کہ قادیانیت کا رد لکھنے کے لیے اسے مرزا غلام احمد کی کتابیں عاریتاً دے دی جائیں۔ نیاز مندوں نے مولانا سے کہا کہ سب کتابیں بیک وقت نہ دی جائیں' مگر سادہ مزاج مولانا نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا' وہ اس چرب زبان کے قائل ہو چکے تھے۔ وہ شخص ساری کتابیں لے گیا۔ مگر پھر کبھی نظر نہ آیا۔

جناب محمد متین خالد کی زیر نظر کتاب قادیانیت کے اصل چہرے کو بے نقاب کرتی ہے۔ وہ مرزا غلام احمد کے عقائد و عزائم کو' ان کی قدیم اور اصل کتابوں کے عکسی نقول کی صورت میں سامنے لائے ہیں۔

قادیانیوں کی اپنی ہی مطبوعہ کتابوں کی یہ شہادتیں' قادیانیت کی ایک ایسی تصویر پیش کرتی ہیں' جس سے عام مسلمان ناواقف ہیں۔ امت مسلمہ اور عالم اسلام کے لیے یہ تصویر بے حد خوفناک ہے اور انسانیت و اخلاق کی سطح پر نہایت پست اور شرم ناک ہے۔۔۔۔ نقل کفر' کفر نباشد' ہم دل پر پتھر رکھ کر تصانیف مرزا اور کتب قادیانیت سے بعض اقتباسات اور جملے نقل کرتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد' نبوت کا دروازہ کھلا ہے" (ص ۱۰۳)۔ "میں خود خدا ہوں" (ص ۱۳۲)۔ "ایک بار مجھے الہام ہوا تھا کہ خدا قادیان میں نازل ہو گا' اپنے وعدے کے مطابق" (ص ۸۶)۔ "خدا تعالیٰ میرے وجود میں داخل ہو گیا" (ص ۸۸)۔ "ہر شخص ترقی کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑا درجہ پا سکتا ہے حتیٰ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ سکتا ہے۔۔۔۔" (ص ۲۴۳)۔ "آپ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو گالیاں دینے اور بد زبانی کی اکثر عادت تھی۔۔۔۔ کسی قدر جھوٹ بولنے کی بھی عادت تھی" (ص ۲۴۹)۔ "جو شخص قرآن شریف پر ایمان لاتا ہے' اس کو چاہیے کہ ابو ہریرہ کے قول کو ایک ردی متاع کی طرح پھینک دے" (ص ۳۰۶)۔ ابو بکر و عمر کیا تھے؟ وہ تو حضرت غلام احمد کی جوتیوں کے تسمہ کھولنے کے بھی لائق نہ تھے" (ص ۳۰۷)۔ تین شہروں کا نام اعزاز کے ساتھ قرآن شریف میں درج کیا گیا' مکہ اور مدینہ اور قادیان۔۔۔۔۔" (ص ۳۵۳)۔ "مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود کی مسجد ہے' جو قادیان میں واقع ہے۔۔۔" (ص ۳۵۴)۔ "لوگ معمولی اور نفلی حج کرنے کو بھی جاتے ہیں' مگر اس جگہ [قادیان میں] نفلی حج سے ثواب زیادہ ہے" (ص ۳۵۵)۔ "میرے والد مرزا غلام مرتضیٰ نے ۱۸۵۷ء میں اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکار انگریزی کو مدد دی تھی یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانہ غدر کے وقت سرکار انگریزی کی امداد میں دیے تھے" (ص ۷۵۵)۔ "مسلمان لوگوں" کے مقابلے میں "انگریزی سلطنت تمھارے لیے ایک رحمت ہے' تمھارے لیے ایک برکت ہے" (ص ۷۶۹)۔ "میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں" (ص ۷۷۱)۔ "میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے" (ص ۷۷۳)۔ [ہم] قدیم سے سرکار انگریزی کے پکے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں [چاہیے کہ وہ] اس خود کاشتہ پودہ۔۔۔۔ کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں" (ص ۷۷۵)۔ "جس کو میری دعوت پہنچی اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا' وہ مسلمان نہیں ہے" (۲۹۳)۔

قادیانیت کی ان کتابوں میں اس طرح کی بہت کچھ لغویات و خرافات ملتی ہیں۔ ان تحریروں کا ایک حصہ تو بالکل کوک شاستر قسم کا ہے اور ہر طرح کے احساس شرم و حیا کو بالاے طاق رکھے بغیر اس میں سے کوئی اقتباس نقل کرنا ممکن نہیں۔ مرزا کا اسلوب تضاد بیانی، ذہنی مجہولیت اور انتشار خیالات کا ملغوبہ ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں: "ناحق گالیاں دینا سفلوں اور کمینوں کا کام ہے" (ص ۳۷۰) مگر خود مخالفین پر بکثرت لعنت بھیجتے اور ان کے لیے شیطان، منحوس، ملعون، کذاب، خبیث، سفیہوں کا نطفہ، بدکار، ولدالحرام اور رنڈیوں کی اولاد --- جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ لغویت اور مضحکہ خیزی کی حد تو یہ ہے کہ جب کسی پر ہزار بار لعنت بھیجنا چاہتے ہیں تو طرز تحریر یہ ہوتا ہے: ا لعنت، ۲ لعنت، ۳ لعنت..... اور اس طرح کئی صفحے سیاہ کرنے کے بعد ۱۰۰۰ لعنت تک پہنچ کر ہی ان کی تسکین ہوتی ہے (ص ۶۶۱-۲۶۵)۔

کیا قادیانی مملکت پاکستان کے وفادار ہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کے بارے میں قادیانیت اور بھارتیا جنتا پارٹی اور کانگریس کے خیالات اور مقاصد میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کا مقصود "اکھنڈ بھارت" ہے۔ یہ جملے: "ہم ہندستان کی تقسیم پر رضامند ہوئے تو خوشی سے نہیں، بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح پھر متحد ہو جائیں" --- کسی پٹیل، نہرو یا گاندھی کے نہیں بلکہ مرزا بشیر الدین محمود کے ہیں (روزنامہ "الفضل" ۱۷ مئی ۱۹۴۷)۔

قیام پاکستان کے موقع پر مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کا صفایا ہو گیا، مگر مرزائیوں کا مرکز قادیان علیٰ حالہ قائم و برقرار ہے۔ قادیانیوں کو وہاں آمدورفت اور رہایش کی اجازت ہے حالانکہ (قادیانیوں کے علاوہ) دیگر پاکستانیوں کے لیے پورا مشرقی پنجاب ممنوعہ علاقہ ہے۔ پنجاب کے کسی شہر کا ویزا تو درکنار، وہ اس حصے میں سفر بھی نہیں کر سکتے بلکہ وہ وہاں سے گزر بھی نہیں سکتے (پنجاب سے آگے جانے والوں کو صرف بند ٹرین میں رات کے وقت یہاں سے گزارا جاتا ہے)۔ بھارت کی مسلم دشمنی اور پاکستان دشمنی مسلم ہے، مگر قادیانیوں سے یہ خصوصی رعایت کیوں؟ اس لیے کہ قادیان کا ایک "روحانی مرکز" کے طور پر برقرار رہنا ہندو سامراج کے مفاد میں ہے۔ ماہ گذشتہ ڈاکٹر شنکرداس کا ایک اقتباس قارئین ترجمان القرآن کی نظر سے گزرا ہو گا، جسے مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے "بندے ماترم" سے نقل کیا تھا۔ اس کے مطابق ہندوؤں کو "اگر امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے تو وہ احمدیت کی تحریک ہے" کیونکہ: "مسلمان جس قدر احمدیت کی طرف راغب ہوں گے، اسی قدر قادیان کو مکہ تصور کرنے لگیں گے؟ --- ایک احمدی، خواہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہو، روحانی شکتی حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا منہ قادیان کی طرف کرتا ہے"۔

خدا کے فضل و کرم سے پاکستان قائم و دائم ہے (اور ان شاء اللہ قائم رہے گا) مگر متذکرہ بالا پس منظر میں بالکل واضح ہے کہ قادیانیوں کا مفاد ایک کمزور پاکستان میں ہے۔ قدرتی طور پر وہ نہیں چاہیں گے کہ ملک

مستحکم ہو' اخلاقی اور معاشی اعتبار سے ترقی کرے اور یہاں امن و امان قائم رہے---- قیام پاکستان سے تاحال سرکردہ قادیانی افسران اور بعض کلیدی مناصب پر فائز قادیانیوں کے کردار کو اس پس منظر میں دیکھیں (اس کی کچھ تفصیل جناب بشیر احمد کی کتاب' **Ahmadiyya Movement: British - Jewish Connections** راولپنڈی' ۱۹۹۴ میں ملتی ہے) تو علامہ اقبال کے اس جملے کی معنویت اور واضح ہوتی ہے کہ: احمدی اسلام اور ہندستان دونوں کے غدار ہیں"۔

ہنود کے ساتھ ساتھ یہود سے بھی ان کا خاص تعلق استوار ہے۔ اسرائیل' عالم اسلام کے لیے ناسور کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی پاکستانی مسلمان کو اسرائیل کا ویزا نہیں مل سکتا' مگر قادیانیوں کو یہودی ریاست میں مستقل مشن قائم کرنے کی اجازت ملی اور وہ سالہا سال سے وہاں کام کر رہے ہیں۔ کئی سال پہلے کی مصدقہ رپورٹ کے مطابق حیفہ میں ایک قادیانی "مسجد"' ایک مشن ہاؤس' ایک لائبریری' ایک ڈپو اور ایک اسکول موجود ہے اور "البشری" کے نام سے ایک ماہنہ عربی رسالہ بھی جاری ہے--- یہودیوں کو قادیانیوں پر اس درجہ اعتماد ہے کہ انھیں اسرائیلی فوج میں بھی بھرتی کیا جاتا ہے۔ ۱۹۷۲ تک اسرائیلی فوج میں چھ سو پاکستانی قادیانی شامل ہو چکے تھے (ص ۸۴۲' ۸۴۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ خوے غلامی قادیانیت کی سرشت میں شامل ہے۔ غلامی ہندو کی ہو' یہود کی ہو یا انگریز کی' اسے یہ خوبی راس آتی ہے۔ کسی آزاد فضا اور پاکیزہ ماحول میں اس کی نشوونما ممکن نہیں۔ اس لیے جب پاکستان میں ان پر گرفت ہوئی اور عدالتوں کا سامنا کرنے کا خدشہ پیدا ہوا تو مرزا طاہر احمد' لندن جا کر انگریزوں کے "سایہ رحمت کے نیچے" (ص ۸۷۷) جا بیٹھے۔ انگریزوں کے اس "خود کاشتہ" گروہ کو اماں ملی تو کہاں ملی۔ "حیات احمد" کے مصنف کا یہ اقتباس: "جھوٹے آدمی کی یہ نشانی ہے کہ جاہلوں کے روبرو تو بہت لاف گزاف مارتے ہیں' مگر جب کوئی دامن پکڑ کر پوچھے کہ ذرا ثبوت دے کر جاؤ تو جہاں سے نکلے تھے' وہیں داخل ہو جاتے ہیں" (ص ۳۰)' اس صورت حال پر صادق آتا ہے۔ مختصر یہ کہ قادیانیت' اس وقت یہود' ہنود اور نصاریٰ (بطور خاص برطانیہ) کے تعاون و اعانت سے پرورش پا رہی ہے--- بہ مصداق: اَوْلِيَاءُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (المائدہ ۵:۵۱)۔

قادیانی اس بات پر بہت پیچ پا ہیں کہ ۷ ستمبر ۱۹۷۴ کو پاکستان کی پارلیمنٹ نے انھیں غیر مسلم قرار دیا۔ پھر امتناع قادیانیت آرڈیننس (۱۹۸۴) کی رو سے انھیں اسلامی شعائر کے استعمال اور خود کو مسلمان کہنے' کہلانے یا ظاہر کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ سوال یہ ہے کہ جب انھوں نے ایک صدی پہلے مسلمانوں کا معاشرتی مقاطعہ کیا تھا (مسلمانوں کی اقتدا میں نماز' شادی بیاہ اور غیر قادیانیوں کی نماز جنازہ میں شرکت کی ممانعت وغیرہ) اور امت مسلمہ کو غیر مسلم قرار دیا تھا ("ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہ

سمجھیں"۔ (ص ۴۳۰) تو اب شکوہ کس بات کا؟___ ان کے اسی رویے کی بنا پر ہی علامہ اقبال نے انھیں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مسئلہ اٹھایا تھا۔ جب وہ مسلمانوں سے اس حد تک مختلف ہیں کہ مملکت پاکستان کے مسلمان سربراہ کو' اسی مملکت کا قادیانی وزیر خارجہ اس لائق نہیں سمجھتا کہ وہ اس کی نماز جنازہ میں شریک ہو تو پھر وہ مسلمانوں کے شعائر' مخصوص نشانات' علامات' اور اعمال و عبادات کے طور طریقوں کو اختیار کیے رکھنے پر کیوں مصر ہیں؟ وہ امت مسلمہ سے الگ نئے شعائر کیوں نہیں وضع کر لیتے؟ جیسا کہ سپریم کورٹ نے سوال اٹھایا: "کیا ان کا نیا مذہب اپنی طاقت' میرٹ یا صلاحیت کے بل پر ترقی نہیں کر سکتا یا فروغ نہیں پا سکتا کہ اسے جعل سازی و فریب سے خود کو "مسلمان" بنا کر پیش کرنا پڑتا ہے؟ "آخر کار دنیا میں اور بھی بہت سے مذاہب ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں یا دوسرے لوگوں کے القابات وغیرہ پر کبھی غاصبانہ قبضہ نہیں کیا"___ قادیانیت مسلمانوں کا لبادہ اوڑھ کر دنیا کے سامنے آنا چاہتی ہے۔ یہ فریب کاری کی کوشش ہے اور اس لیے قابل مذمت ہے۔

محمد متین خالد نے بڑی دیدہ ریزی اور جانکاہی سے یہ تحقیق کی ہے اور اس پر بہ ہر طور تعریف و تحسین کے مستحق ہیں۔ سو سال پرانی کتابوں کی تلاش و دریافت ہی جاں جوکھم کا کام ہے۔ پھر خالد صاحب نے پورے مواد کو مختلف عنوانات کے تحت بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ قادیانیت پر یہ ایک مستند دستاویز ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے "ثبوت حاضر ہیں" سے اعتنا و استفادہ ناگزیر ہو گا۔ کتاب عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت' حضوری باغ' ملتان نے شائع کی۔ صفحات ۸۴۳' اور عمدہ مجلد نسخے کی قیمت ۳۰۰ روپے ہے۔ لاہور میں مکتبہ تعمیر انسانیت' اردو بازار سے دستیاب ہے۔

۲۱ویں صدی کا اقتصادی چیلنج اور اسلامی معاشیات

مشرقی ایشیا کے حالیہ بحران کی روشنی میں

سید حامد عبدالرحمٰن الکاف

جناب سید حامد عبدالرحمٰن الکاف (صنعاء، یمن) نے وقت کے چند اہم معاشی اور مالیاتی مسائل کی طرف متوجہ کیا ہے۔ جن سوالات کو اٹھایا گیا ہے ان پر گہرے غور و خوض اور تبادلہ خیال کی ضرورت ہے۔ اگر اسلامی معاشیات اور بین الاقوامی معیشت سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم، متعلقہ امور کے بارے میں اختصار سے اپنا تجزیہ اور تجاویز پیش کرنا چاہیں تو ادارہ اسے خوش آمدید کہے گا۔ (مدیر)

جب کبھی عصر حاضر کے اقتصادی اور مالی مسائل کے حل کی بات چھڑتی ہے تو کچھ حضرات یہ کہہ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ اگر موجودہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت سے سود خواری، سٹہ بازی، ذخیرہ اندوزی اور جعل سازی وغیرہ کے چند گنے چنے عناصر نکال دیے جائیں تو سارے ہی اقتصادی اور مالی مسائل ازخود حل ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے ان کی ساری گفتگو اور استدلال کا رخ ان گنے چنے امور کی طرف ہوتا ہے اور وہ کلی تصورات زیر بحث نہیں آتے جو آج کل کی نہ صرف قومی اقتصادیات کا بلکہ عالمی اقتصادی نظام کا امتیازی نشان ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سود وغیرہ ایسے عناصر ہیں جن کے وجود کے ساتھ کسی بھی اقتصادی نظام سے خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی اقتصادی نظام --- خصوصاً عصر حاضر کا اقتصادی نظام --- صرف ان عناصر سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس میں دیگر ایسے عناصر اور عوامل بھی ہیں جن کے بارے میں مسلم ماہرین معاشیات اور مالیات کو غور و فکر کرنا چاہیے۔

جنوب مشرقی ایشیائی اقتصادی بحران کے ابتدائی مراحل میں سٹہ بازی، جوا بازی، سود خواری اور دیگر تباہ کن اقتصادی امور کا ذکر بار بار آتا رہا مگر جوں جوں دن گزرتے گئے اور اس بحران کے ظاہری اسباب و عوامل کے ذکر سے گزر کر نظر زیادہ گہرے اسباب کی طرف متوجہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ اصل مرض کے

صرف مظاہر تھے، اصل مرض نہ تھا۔ اصل مرض، ان سارے ہی اقتصادیات خصوصاً جاپانی اقتصادی نظام کے غلط انداز میں چلائے جانے کا نتیجہ تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ان اقتصادیات کا، جن میں جاپانی اقتصاد بھی شامل ہے، اچانک بیٹھ جانا ہے۔ اس کے بھی چند اسباب ہیں جن پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

سود، سٹہ بازی، نفع خوری وغیرہ کے علاوہ اس بحران کا سب سے اہم سبب عالمی اقتصاد میں وہ دور رس تبدیلیاں ہیں جو آخری ربع صدی میں وقوع پذیر ہوئی ہیں اور جن کے نتیجے میں قومی اقتصادیات کچھ اس طرح آپس میں مربوط ہو چکی ہیں کہ اب قومی سطح پر منصوبہ بندی ایک فرسودہ تصور ہو چکا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ منصوبہ بندی کم از کم علاقائی سطح پر کی جائے، مثلاً جنوب مشرقی ایشیا، بحرالکاہل اور بحرہند پر واقع ممالک، تاکہ ان علاقوں کی اقتصادیات پیداوار کے میدانوں میں ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں۔

علاقوں کی بنیاد پر منصوبہ بندی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ ذرائع معلومات کی سرعت، فراوانی اور ارزانی کی وجہ سے ---- سٹلائٹس اور کمپیوٹرز کے ذریعے ---- نقد سرمایہ کا ایک مالی مرکز، مثلاً ٹوکیو سے، دوسرے مالی مرکز، مثلاً ہانگ کانگ منتقل ہونا بہت زیادہ آسان ہو گیا ہے اور یہ پلک جھپکنے میں ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے ایک مالی مرکز سے کروڑوں اور اربوں ڈالر کا سرمایہ دوسرے مالی مرکز کو چند لمحات میں منتقل ہو رہا ہے۔ سرمایے کو پر لگ چکے ہیں اور وہ اعلیٰ تر شرح سود کی تلاش میں، عالمی پیمانے پر، ایک مالی مرکز سے دوسرے مالی مرکز تک اڑتا پھر رہا ہے اور جس مالی مرکز سے یہ گزرتا ہے، ایک طوفان کی طرح درودیوار کو اور اس کے راستے میں آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کر کے گزر جاتا ہے۔ اس کی جیتی جاگتی اور ناقابل تردید مثالیں ہانگ کانگ، ٹوکیو، نیویارک، شکاگو اور کوالالمپور کے مالی مراکز کی گذشتہ سات ماہ سے مسلسل تباہی اور بربادی ہے۔ اس تباہی اور بربادی میں کم از کم دو ٹریلین ڈالر جل بھن گئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں کئی ملین لوگ بے روزگاری کا شکار ہو جائیں گے۔

اس حقیقت کا اظہار ۳۰ دسمبر ۱۹۹۷ کو لحمن برادرز (Lehman Bros) کے چیف اکنومسٹ نے بے روزگاری کے اعداد و شمار کی شکل میں کیا ہے کہ ۱۹۹۸ کے ختم ہوتے ہوتے امریکہ میں بے روزگاری کی شرح ۴ء۴ فی صد سے بڑھ کر ۲ء۵ فی صد ہو جائے گی۔ جب سائل نے ۵ء۵ فی صد شرح پر بے روزگاری کے رکنے کی توقع ظاہر کی تو اس نے ۲ء۵ فی صد پر اصرار کیا اور کہا کہ جنوب مشرقی ایشیا کے معاشی بحران کا اثر امریکی اقتصاد پر بڑا گہرا اور دور رس ہے۔ اس نے مزید کہا کہ اس بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے پیش نظر ۹۸ء میں شرح سود میں اضافے کی کوئی توقع نہیں ہے۔

ہمیں یہاں عالمی پیمانے پر پھیلنے والی بے روزگاری کے دوسرے اسباب کو فراموش نہیں کرنا چاہیے، مثلاً سوشل سیکورٹی کی سرگرمیوں میں مسلسل کمی ہے۔ اسی طرح حالات کو غیر یقینی بنانے اور بحرانی کیفیت کو

تیز تر کرنے میں مختلف کرنسیوں (سکوں) کے ایک دوسرے سے ربط و ضبط اور ان کے تبادلے میں تخمینہ اور سٹہ کا بڑا دخل ہے۔

یہ سب عوامل ہمیں کشاں کشاں اس بڑی حقیقت کی طرف لے جا رہے ہیں جو اکیسویں صدی کا شاید سب سے بڑا واقعہ تصور کیا جانے والا ہے اور وہ ہے تجارت، کاروبار اور لین دین کا عالمی شکل اختیار کرنا اور جس کو عملی جامہ پہنانے کا کام "عالمی تجارتی تنظیم" (World Trade Organisation) نے اپنے ذمے لیا ہے۔ یہ تنظیم مختلف قوموں کو اپنے جال میں پھانسنے کے لیے زمین کے ہم رنگ جال بننے میں مشغول ہے اور مختلف اقتصادیات کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے ہر طرح کی تدابیر اختیار کر رہی ہے۔

اسلامی ماہرین اقتصادیات اور مالیات کے نقطہ نظر سے جو پہلو غور طلب ہیں، ان میں مندرجہ ذیل کو خصوصی اہمیت حاصل ہے:

۱۔ اکیسویں صدی میں اقتصاد عالم ایک ایسی وحدت میں تبدیل ہو جانے والی ہے جس کا ہر جز دوسرے جز سے تجارت، زرکاری، قرض کاری اور سرمایوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے نہ صرف مربوط ہو گا بلکہ مثبت یا منفی حیثیت سے متاثر ہو گا یا متاثر کرے گا۔ اس لیے اقتصادیات کے عالمی پہلوؤں پر گہری نظر رکھنے اور عالمی حل پیش کرنے کی ابھی سے مناسب تیاریاں کی جانی چاہئیں۔ اس کے لیے پہلے تو قومی، علاقائی اور عالمی اقتصادیات پر کلی نظر پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ دوسرے درجے میں بیدار مغز افراد کو ایک ایسے عالمی ادارے میں جمع کرنے کی سخت ضرورت ہے جو ان درپیش مسائل کا نہ صرف فوری حل تلاش کریں بلکہ ان کو نظریاتی ڈھانچے میں ڈھالنے کی کوشش بھی کریں۔

۲۔ دوسرے درجے میں علاقائی اقتصادیات ہیں جو ایک دوسرے سے بہت گہرے انداز میں مربوط ہیں، ان کے درمیان باہمی مقابلے اور ٹکراؤ کے بجائے زیادہ سے زیادہ تعاون اور توافق کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ ان خطوط پر سوچنا، منصوبہ بندی کرنا اور اس کو بطور مشورہ بروقت اور مناسب انداز میں پیش کرنا، ماہرین مالیات اور اقتصادیات کا کام ہے۔ اسلام دوست ماہرین کو بھی اس میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے۔

۳۔ اب سرمایہ کاری اور قرض کاری مقامی امور نہیں ہیں۔ یہ عالمی پیمانے پر طے ہو رہے ہیں اور ان میں مالی مراکز بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان مالی مراکز کو زیادہ سے زیادہ صحیح خطوط پر چلانا تاکہ مسلمان ملکوں کو کم سے کم ضرر پہنچے، مسلمان ماہرین اقتصادیات اور مالیات کا بنیادی فرض قرار پاتا ہے۔

سب ہی جانتے ہیں کینز کے نقد ترجیحی (Liquidity Preference) اور سٹہ بازی کے جذبے (Speculative Motive) کے نظریات نے سٹہ بازی اور نفع خوری کو مالیاتی نظاموں اور مالی مراکز کا جزو لاینفک بنا دیا ہے۔ ہمارا کام ہے کہ ان مالی نظاموں اور مراکز کو سٹہ بازی اور نفع خوری کے چنگل سے آزاد

کرانے کے لیے پہلے نظریاتی کوششیں کریں اور پھر عملی اقدامات تجویز کریں۔ عالمی پیمانے پر کئی کئی برس جاری رہنے والے مالی اور اقتصادی بحرانوں نے اب ہماری بات سننے اور سمجھنے کے لیے اچھی خاصی نفسیاتی فضا پیدا کر دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اس نفسیاتی فضا کو اپنے حق میں ــــ اسلام اور اسلام کے مالیاتی اور اقتصادی اصولوں کے حق میں ــــ استعمال کر سکیں؟ اس کا جواب بھی اسی ادارے کا قیام ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے بہتر فضا نہ پہلے تھی اور نہ شاید مستقبل قریب میں پھر پیدا ہو۔ ضرورت اس سے فائدہ اٹھانے اور جلد از جلد فائدہ اٹھانے کی ہے۔ اس میں سب سے اہم عنصر ان افراد کا ہے جو اس ادارے میں کام کرنے کے لیے چنے جائیں۔ یہ کام وہی لوگ انجام دے سکیں گے جن کی ایک طرف کتاب و سنت میں مجتہدانہ نظر ہو' اور دوسری طرف وہ علمی اور تجرباتی اعتبار سے اتنے لائق ہوں کہ وہ اکیسویں صدی کے اسٹرے ٹیجیات (Strategies) پر گہری نظر رکھتے ہوں اور ان کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے قابل عمل لائحہ عمل ضروری نظریاتی بنیادوں کے ساتھ پیش کر سکتے ہوں کیونکہ اجتہادی بصیرت اور تشکیل نو کی صلاحیت کے بغیر کسی بھی میدان میں پیش رفت مشکل ہے۔

۴- عالمی پیمانے پر پھیلتی ہوئی بے روزگاری اور اس کے اسباب کا کھوج لگانا اور ان کے حل کے لیے عملی تجاویز پیش کرنا' ان حضرات کا کام ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں انھیں بعض نہایت خاردار مسائل پر غور و فکر کرنا اور قلم اٹھانا پڑے گا' مثلاً ہائی ٹک اور بے روزگاری کا تعلق؟ کیا یہ ایک حقیقت ہے یا صرف افسانہ ہے؟ اگر حقیقت ہے تو کس حد تک اور کن حدود میں؟ ان حدود کی تشخیص اور تعین؟ اوقات کار اور پنشن کی عمروں میں مختلف پیشوں کے اعتبار سے کمی اور اس کے اخلاقی نتائج اور حسب ضرورت موانع حمل سے متعلق مسائل پر دینی نقطہ نظر سے نظرثانی اور اس کے جواز اور عدم جواز کے حدود؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب بڑے حساس مسائل ہیں جو مجتہدین مطلق کے منتظر ہیں۔ ان کو جمع کرنا ہی عصری ضروریات کا سب سے بڑا مطالبہ ہے۔

۵- بڑے پیمانے پر مسلم امہ کے سرمایے کو اکٹھا کرنا اور اس کو مفید اور بار آور منصوبوں میں اسلامی نقطہ نظر سے لگانا' وقت کی پکار ہے۔ یہ سرمایہ کئی ٹریلین ہو سکتا ہے اور آج بھی ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بڑے غور و فکر کا محتاج مسئلہ ہے تاکہ عملی تدابیر تک پہنچا جا سکے۔ یہ ہزار پہلو مسئلہ ہے جس کا آسان اور عملی حل تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اس لیے سنجیدہ اور دور رس کوششوں ــــ علمی اور عملی کوششوں ــــ کی سخت ضرورت ہے۔

٦- سرمایے کو جمع کرنے اور مفید منصوبوں میں لگانے کے ساتھ ہی ہم قرض کاری کے اصولوں کی اہمیت اور ان پر عمل پیرا ہونے اور دوسروں کو عمل پر ابھارنے والے افراد کے مسئلے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اس میدان میں سنجیدگی کے ساتھ پیش رفت کی سخت ضرورت ہے۔

رسائل و مسائل

خانقاہ کو مرکز ہدایت بنایئے

میں ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے والد صاحب تصوف میں سلسلہ قادریہ' نقشبندیہ سے منسلک تھے۔ اپنی خانقاہ میں بندگان خدا کو تزکیہ نفس کی طرف دعوت دیتے رہے۔ ۱۹۸۷ء میں ان کی وفات ہوئی۔ مریدوں نے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ان کو یہاں دفن کرنا چاہا تاکہ مزار بنایا جائے اور مجھے روایتی گدی نشین ہونے کو کہا۔ میرا تعلق اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ سے تھا اور مجھے خانقاہی تصوف سے اتفاق نہیں تھا۔ مریدوں کے بے حد اصرار کے باوجود والد صاحب کے جسد خاکی کو آبائی علاقے (دیر) میں دفن کیا گیا۔ تاہم اس کے باوجود بھی مریدوں نے مجھے سجادہ نشین تسلیم کیا۔ کچھ مدت تک تو اس سلسلے کو چلاتا رہا۔ مگر جب بھی تنہائی میں سوچتا تھا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ چنانچہ اس سلسلے کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن میرے بعد بھی ہماری اس خانقاہ میں عقیدت مند اس سلسلے کو چلاتے رہے۔ کچھ احباب نے مجھے مشورہ دیا کہ اس طرح دور رہ کر آپ خود تو مطمئن ہو جائیں گے مگر ان لوگوں کو اصلاح کی طرف کون لائے گا؟ چنانچہ اسی وجہ سے ۱۹۹۵ء سے میں نے باقاعدہ اپنی خانقاہ کو سنبھالا اور ذکر و فکر کی ان مجلسوں کو اب درس قرآن و حدیث کے حلقے میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں' تاہم اس کے باوجود مرید والد صاحب کا عرس باقاعدہ مناتے ہیں۔ جب سے میں آیا ہوں تب سے وہ خرافات جو ان عرسوں' میلوں میں ہوتے ہیں' نہیں ہیں۔ صرف قرآن خوانی اور نعت خوانی کے علاوہ علما کی تقریروں کے بعد محفل ذکر اور آخر میں اجتماعی دعا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں چند سوالات کا تسلی بخش جواب چاہتا ہوں:

۱۔ کیا تصوف کے اس سلسلہ قادریہ' نقشبندیہ' سہروردیہ' چشتیہ وغیرہ کو باقاعدہ جاری رکھنا کوئی دینی خدمت ہے؟ کیا یہ جدوجہد دین الٰہی کی جدوجہد کے متبادل کے طور پر جائز ہے؟

۲۔ عرس و ختم پر جمع ہونے والی رقم کی کیا حیثیت ہے؟ اس کے علاوہ بھی مریدین نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ میرے اصرار کے باوجود وہ ہدیے کے طور پر دیتے ہیں جبکہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نذرانہ ہے مگر میری وجہ سے وہ ہدیہ کرتے ہیں۔ کیا یہ لینا میرے لیے جائز ہے؟

۳۔ عقیدت مند روحانی و جسمانی بیماریوں کے سلسلے میں' دم تعویذ کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ قرآن و سنت

کہاں تک اس کی اجازت دیتا ہے؟

۴- واضح رہے کہ اس میں مستورات کے بھی مسائل ہوتے ہیں۔ کیا غیر عورت سے اس قسم کی گفتگو کرنا (شادی، بیاہ، پسند، ناپسند وغیرہ کے مسائل) جائز ہے؟

۵- مرید ایک خاص قسم کے اوراد کی اجازت، ریاضت کے لیے طلب کرتے ہیں، مثلاً حزب البحر، ختم خواجگان، درود تاج اور اس قسم کے دوسرے اوراد جن کے بارے میں میرے علم کے مطابق قرآن و سنت سے کوئی واضح ثبوت نہیں ملا۔ یہ اوراد و اشغال کرنا یا ان کی اجازت دینا کہاں تک درست ہے؟

۶- میں شادی شدہ ہوں اور چار بچے ہیں۔ میری یہ خاندانی شادی ہے۔ مادری زبان پشتو اور لوگوں کے ان پڑھ ہونے کی وجہ سے یہاں بڑے مسائل ہیں جبکہ اس سلسلے میں زیادہ تعلق مردوں کے ساتھ عورتوں سے بھی رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان مرید عورتوں کی تربیت و اصلاح کے لیے تعلیم یافتہ خاتون سے دوسری شادی کرلوں۔ کیا اسی نیت سے ایسا کرنا جائز ہے جبکہ اس کے علاوہ اور کوئی شرعی ضرورت نہیں؟ کیا اس کے لیے پہلی بیوی سے اجازت شرط ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کا میں مدت سے ذہنی خلجان محسوس کرتا ہوں۔ قرآن و سنت اور سیرت طیبہؐ کی روشنی میں جواب دیں۔

آپ کے خیالات گراں قدر اور وقیع ہیں اور ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ آپ کتاب و سنت کی روشنی میں سوچ بچار کرنے اور شرعی حدود و احکام معلوم کر کے ان کے مطابق چلنے کا عزم رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت عطا فرمائے اور آپ کے ذریعے مسلمانوں کو رشد و ہدایت کا فیض پہنچائے۔ آمین! آپ کے سوالات کا جواب حسب ذیل ہے:

۱- آپ خانقاہی نظام کو شرعی حدود کے مطابق چلائیں۔

۲- قرآن و سنت کا وسیع مطالعہ کریں اور اس کی روشنی میں خلق خدا کی راہنمائی فرمائیں۔

۳- سیرت النبیؐ، سیرت صحابہ، سلف صالحین، ائمہ مجتہدین اور بزرگان دین کے سچے اور صحیح واقعات کا مطالعہ کر کے متعلقین کو ان سے فیض یاب کریں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اقامت دین کی جو جدوجہد شروع کی ہے، وہ اس دور میں قرب الٰہی کا اصل ذریعہ ہے کہ یہ وقت کا تقاضا ہے، یعنی اولیں فرض یہ ہے کہ مسلمان حکومت الٰہیہ قائم کریں اور اسلامی نظام نافذ کرائیں۔ جو اس جدوجہد کا تارک ہے، اسے محض ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف سے قرب الٰہی نہیں مل سکتا اور جو یہ کام کرتا ہے، اس کے لیے قرآن پاک کی تلاوت، مسنون دعائیں، اذکار مسنونہ کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک نوجوان اور خوب صورت انسان کا صاف ستھرے اجلے کپڑے پہننا اور تیل کنگھی اور خوشبو لگا کر جسم کو خوبصورت بنانا۔ لیکن جو فریضہ وقت کا تارک

ہو، اس کے لیے اوراد و اذکار اور اشغال کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ٹی بی کے مریض کو خوب صورت اور اجلے کپڑے پہنانا اور تیل سرمہ لگا کر کنگھی کر کے بناؤ سنگھار کرنا۔

۴- آپ مروجہ طریقوں سے ہٹ کر اپنے مریدین کے لیے درس قرآن، درس حدیث، مطالعہ لٹریچر، درس سیرت، بزرگان دین کے حالات پر مشتمل تقاریر اور مواعظ کے پروگرام رکھیں۔

۵- پھر تلاوت قرآن اور اذکار مسنونہ کو معمول بنائیں۔ حزب البحر کا معمول درست ہے۔ اس میں مسنون اذکار ہیں۔

۶- والد صاحب کی یاد میں جلسہ ضرور کریں لیکن بہتر یہ ہے کہ اسے عرس کا نام دے کر وفات کی مقررہ تاریخ پر نہ کریں، آگے پیچھے کر لیا کریں۔ عرس کا نام رکھنا چاہیں تو اس میں کوئی خلاف شرع بات نہیں ہونی چاہیے۔ شرکیہ باتیں اور بدعات کا ارتکاب نہیں ہونا چاہیے۔

۷- دم کرنا اور تعویذ لکھ کر دینا جائز ہے۔ آپ نذرانے نہ وصول کریں۔ ہدیہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن صرف نام کی تبدیلی کافی نہیں ہے۔ اس لیے آپ اسے "اعانت" اور "عطیات" کے نام سے وصول کریں اور مہمانوں کی میزبانی اور دروس قرآن و حدیث کے اخراجات ان سے پورے کریں۔ لوگوں کو کہہ دیں کہ وہ زکوٰۃ و صدقات نہ دیں بلکہ عطیات دیں۔

۸- مستورات سے بقدر ضرورت گفتگو ہو تو وہ بھی پردے کے پیچھے اور ان کو ایسے کاموں کا ذکر کرنے سے منع کر دیں جن سے جنسی جذبات ابھرتے ہوں۔ صرف اوراد اور وظائف کی تعلیم دیں۔ تلاوت قرآن اور اذکار مسنونہ اور اوراد کو معمول بنانا اور لوگوں کو کسی ایک معمول کا مشورہ دینا جائز ہے۔ لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ انتظامی چیز ہے اس میں شرعاً کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ لیکن جس طرح دفتری کاموں کے لیے ملازمین اپنا نظام الاوقات بنا سکتے ہیں، کسان زراعت کے لیے ایک پروگرام ترتیب دے سکتا ہے، اسی طرح آپ اپنے مریدین کو کوئی معمول دے سکتے ہیں تاکہ وہ اس کے مطابق تلاوت اور ذکر و اذکار کریں اور اس طرح سے ان کے روحانی اثرات ان کی زندگیوں میں مرتب ہوں۔

۹- آپ نئی شادی کرنا چاہتے ہیں تو اپنی بیوی کے مشورے سے ایسا کریں تاکہ آپ کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ اپنی سابقہ رفیقہ حیات کے جذبات اور مشورے کا خیال رکھنا اور اس کی رضامندی سے قدم بڑھانا اچھی بات ہے کہ اسلام میں وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی تلقین ہے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ آپ جماعت اسلامی کے مشن کے لیے خانقاہ کو ذریعہ بنا سکیں۔ (مولانا عبدالمالک)

سید اور غیر سید کے نکاح کا مسئلہ

ہمارا ایک مسئلہ ہے جس کی وجہ سے میری بہن بہت مشکل میں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق ہاشمی سید خاندان سے ہے اور میری بڑی بہن کی شادی بھی سادات قوم میں ہوئی ہے جو کہ پیر بھی ہیں۔ اب جبکہ میری دوسری بہن کی شادی خاندان سے باہر' ملک یعنی اعوان قوم میں ہوئی ہے' تو میری بڑی بہن کے سسرال والے یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ سید قوم والے اپنی لڑکی کی شادی غیر سید سے نہیں کر سکتے ورنہ نکاح فسخ ہو جاتا ہے۔ اس بارے میں وہ کئی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں جن میں سے ایک فتاوی رضویہ ہے۔ انھوں نے میری بہن کے میکے آنے جانے پر پابندی لگائی ہوئی ہے۔ جناب! ہم بہت پریشان ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے کہ ہاشمی سید' غیر قوم میں شادی نہیں کر سکتے؟

کیا ہاشمی سید "غیر قوم" میں شادی کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا تعلق تین بنیادی امور سے ہے۔ اول' کیا قرآن و سنت' اہل ایمان میں' ہم قوم اور غیر قوم ہونے کی بنا پر کوئی تفریق تسلیم کرتے ہیں؟ دوم' کیا اسلام کے خاندانی نظام میں نکاح کے درست ہونے کے لیے "کفو" بنیادی شرط ہے؟ اور سوم' رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کا عمل کیا ثبوت پیش کرتا ہے؟

اس سلسلے میں چند نکات آپ کے غور کرنے کے لیے تحریر کیے جا رہے ہیں۔

قرآن کریم انسانی زندگی کے آغاز و قیام کے حوالے سے فرماتا ہے: "لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس جان سے اس کا جوڑا (زوج) بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے" (النساء ۴:۱)۔ یہی بات سورہ الحجرات میں بھی فرمائی گئی: "لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھارے شعوب (قومیں) اور قبائل (برادریاں) بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمھارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار (متقی) ہے" (الحجرات ۴۹:۱۳)۔

ان قرآنی ہدایات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انسان بربنائے تخلیق مختلف نہیں ہیں بلکہ ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے سبب یکساں ہیں۔ یہی وہ عالمگیر انسانیت ہے جس کی بنا پر اسلام نسل و رنگ اور قبیلہ و برادری کی عصبیت کے خلاف اخلاقی جہاد کے ذریعے انقلاب برپا کرتا ہے۔ چنانچہ فرما دیا گیا کہ وجہ امتیاز قبیلہ' ذات' برادری قوم نہیں ہے بلکہ تقویٰ' نیکی' پرہیزگاری' عمل صالح اور کردار و شخصیت ہے۔ قرآن کریم کے اتنے واضح قول فیصل کے بعد برادری یا قومیت کو بنیاد بنانا اور تقویٰ کو پس پشت ڈالنا وہی عمل ہے جسے بنی اسرائیل کی مثال دے کر قرآن پاک نے مختلف مقامات پر سخت ناپسند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد کو جو اپنے باپ دادا کے عمل اور روایات کو بنیاد بنا کر یہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے تو اپنے آباؤاجداد کو یہی

کرتے ہوئے پایا، وہ تو کبھی فلاں قوم یا فلاں برادری کے باہر نکاح اور تعلقات قائم نہیں کیا کرتے تھے، گمراہ اور اللہ رب العالمین کی جگہ اپنے اجداد کو خدا بنانے والا قرار دیا ہے۔

سورۃ الاحزاب میں جس قدر (value) کو نہایت وضاحت سے پیش فرمایا گیا ہے، اس پر ایک نگاہ ڈالیے۔ فرمایا: "بالیقین جو مرد اور عورتیں مسلم ہیں، مومن بھی ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔ کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے میں فیصلہ کر دے تو پھر اسے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا" (الاحزاب ۳۳:۳۴-۳۵)۔

یہاں دو باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ اول، مرد اور عورت میں وجہ مساوات ان کا اسلام، ایمان، طاعت، راست بازی، صبر، اللہ کے سامنے جھکنا، صدقہ دینا، روزہ رکھنا اور اللہ کا ذکر کرنا ہے جو ان کے لیے اس دنیا میں ہدایت اور آخرت میں اجر کا باعث ہے۔ یہاں کسی اشارے کنایے میں یہ بات نہیں کہی گئی کہ شیخ، سید، پٹھان، جاٹ، انصاری، فاروقی، زیدی، علوی ہونا ہدایت یا آخرت میں کامیابی کی علامت ہے۔ نہ یہ فرمایا گیا کہ ان ذاتوں برادریوں یا "قومیتوں" کی بنا پر کوئی امتیاز قائم کیا جا سکتا ہے۔ ان کا مقصد صرف تعارف ہے، یعنی ایک دوسرے کو پکارنے اور ابلاغ عامہ کے لیے ایک نام سے یاد کرنا۔

دوم، یہ بات یہاں واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ قرآن اور سنت کے ایک بات طے کر دینے کے بعد اپنے آبا و اجداد کی دلیل لاتے ہیں اور خود فیصلہ کرنے کا اختیار زبردستی چند جاہلی باقیات کی بنیاد پر حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ ہدایت پر نہیں ہیں۔ قرآن کے اتنے واضح الفاظ میں ایک بات کہہ دینے کے بعد کسی اہل ایمان کے لیے اپنی بات پر اصرار کرنا نہ دانشمندی ہے نہ دین کے ساتھ محبت و تعلق کی علامت۔ اس لیے جتنی جلدی ہو سکے اس رویے کی اصلاح کرنی چاہیے۔

ایک برادری، نسل اور ماں باپ سے تعلق رکھنے والے ان انسانوں کے درمیان اگر فرق کی کوئی بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ نسل یا برادری کی برتری نہیں ہے۔ بلاشبہ اسلام سے قبل طبقاتی اور قومیت و قبیلہ پر مبنی نظام پایا جاتا تھا لیکن اسلام نے ان تمام بتوں کو توڑ کر صرف تقویٰ اور عمل صالح کو برتری کی بنیاد قرار دیا۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتہ ازدواج کے حوالے سے یہ اصول بیان فرمایا کہ عام طور پر ایک عورت سے شادی، اس کی خاندانی شرافت یا حسن و جمال یا دولت کی بنا پر کی جاتی ہے لیکن سب سے بہتر یہ ہے کہ اس کے اخلاق و کردار کی بنیاد پر شادی کی جائے۔ یہ ثقافتی انقلاب اسلام ہی کا کارنامہ تھا۔ اس کے

عملی اظہار کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی ایک اعلیٰ نسب کی ہاشمی صحابیہ حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح ایک "غیر قوم" کے نوجوان صحابی حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ خود فرمایا۔ گویا ایک ہاشمیہ اور غیر ہاشمی کا نکاح اپنے دست مبارک سے کر کے قیامت تک کے لیے اپنے عمل سے یہ مثال قائم کر دی کہ شادی بیاہ کی بنیاد، نسل و خون نہیں بلکہ تقویٰ اور عمل صالح ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ اعلیٰ نسب کے افراد کی شادی ان جیسے ہی اعلیٰ نسب گھرانوں میں ہو۔ بظاہر اس کا سبب "کفو" کا تصور ہے۔ ہمارے فقہا نے رشتہ ازدواج کے حوالے سے "کفو" کے عنوان کے تحت جو بحث کی ہے وہ قرآن و حدیث کے واضح ارشادات کے بعد ثانوی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ حنفی فقہا چھ باتوں کو کفو میں شامل کرتے ہیں: اسلام، خاندان، پیشہ، حریت، دین اور مال۔ ظاہر ہے اگر ایک شوہر مسلم ہے اور بیوی اہل کتابیہ، تو اسلام کے لحاظ سے فرق کے باوجود نکاح باطل نہیں ہوا۔ یا ایک شوہر دین کے لحاظ سے عظیم فقیہ و مفسر ہے، جید محدث ہے جبکہ بیوی دین کا بنیادی علم، حرام و حلال کی حد تک جانتی ہے یا اس کے برعکس، تو دونوں صورتوں میں نکاح باطل نہیں ہو گا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ دین، تفقہ، تقویٰ، پاکبازی، صالحیت جیسے بنیادی اور اہم معاملات میں باہم فرق سے تو نکاح اور رشتہ ازدواج برقرار رہے لیکن اگر حسن، مال یا خاندان یا پیشہ میں فرق ہو تو رشتہ ازدواج خطرے میں پڑ جائے؟

بات نہ مشکل ہے نہ الجھی ہوئی نہ تھی۔ دراصل ہم بعض معاملات میں اپنے اجداد کی روایات کے اتنے سخت غلام ہیں کہ ان سے سرمو ہٹنا اپنے "دین" کے منافی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ "دین" کون سا ہے؟ قرآن و حدیث کی واضح ہدایات والا یا اپنی روایات کی اندھی پیروی کرنے والا۔ یہ فیصلہ چونکہ آباو اجداد کی روایات کے خلاف لے جاتا ہے، اس لیے گھوم پھر کر بات وہیں پر آ کر رکتی ہے کہ کیا ہمارے باپ دادا اور وہ فقہا جو "کفو" کے حوالے سے خاندان کا ذکر کرتے ہیں --- دین سے ناواقف تھے۔

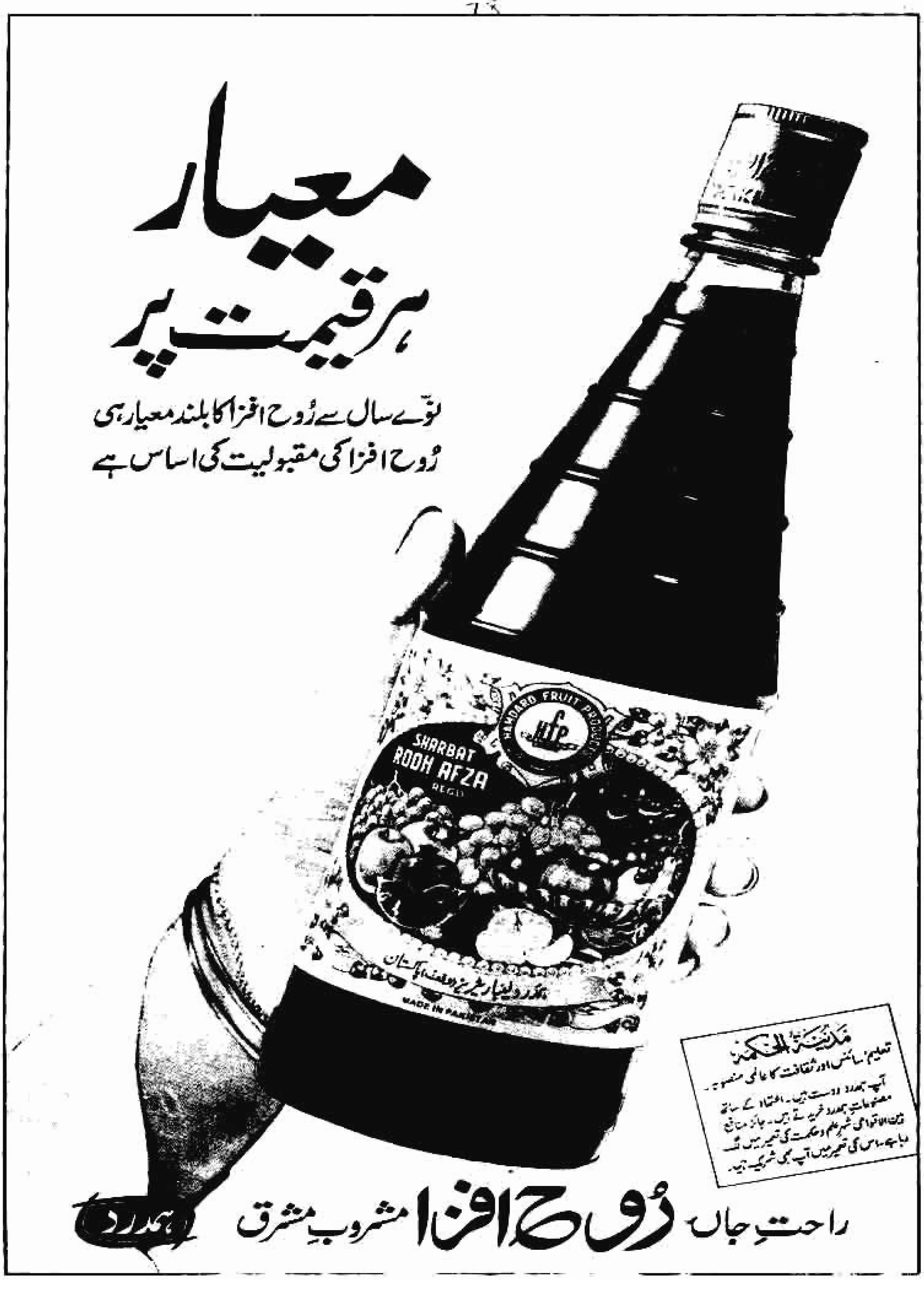
جن فقہا نے "کفو" پر بات کی ہے، وہ کسی مقام پر یہ نہیں کہتے کہ اگر انتخاب تقویٰ، حسن، دولت اور خاندان میں ہو تو ایک فاسق و فاجر "اعلیٰ خاندان" والے، فلاں نسب والے سے شادی کر دی جائے۔ قرآن کا اصول ہے کہ صالح مرد کے لیے صالح عورت اور خبیث مرد کے لیے خبیث عورت۔ کسی بڑے سے بڑے فقیہ کی اجتہادی رائے بھی اس اصول کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ بنیاد صالحیت، تقویٰ، عمل صالح اور نیکی ہے، نہ کہ کچھ اور۔

ہاں خاندان اور نسب کے بارے میں اگر ثانوی حیثیت سے غور کیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ایک فرد تقویٰ، عمل اور ادب و اخلاق کے لحاظ سے کیسا ہے؟ اس کے اطوار و عادات کیسے ہیں یا جن دو گھروں میں قریبی تعلق پیدا ہونے جا رہا ہے، ان کا رہن سہن کیسا ہے؟ کیا دونوں میں کوئی مشترک اقدار ہیں یا بعد

المشرقین؟ فرض کیجیے ایک گھرانے میں ہر فرد تعلیم یافتہ، ادبی ذوق رکھنے والا ہے جبکہ دوسرے گھر میں نہ تعلیم کا رواج اور شوق ہے نہ رہن سہن میں سلیقہ اور صفائی ہے۔ ظاہر ہے شادی کے بعد جب دو افراد اور دو خاندانوں کو ایک ساتھ رہنے کا اتفاق ہو گا تو ہر معاملے میں اس تضاد کی بنا پر مشکلات پیش آئیں گی۔ ایک معمولی سی مثال جو ہمارے معاشرے میں عام طور پر نظر آتی ہے، یہ ہے کہ بعض گھرانوں میں گفتگو میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے، وہ ان کی اپنی روایات میں چاہے قابل اعتراض نہ ہو لیکن ایک نئے آنے والے فرد کے لیے وہ صدمے (shock) کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر ایک لڑکے یا لڑکی نے بچپن سے اپنے والدین اور اقربا کو ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے ہوئے "آپ" یا حد سے حد "تم" کا لفظ سنا ہو اور شادی کے بعد ہر لمحے اسے "تو" کہا جائے تو اس کا یہ سمجھنا کہ اسے کمتر سمجھ کر بات کی جا رہی ہے، بے جا نہ ہو گا۔ معاملہ حسن اور نسب کا نہیں، محض طرز تخاطب اور طرز عمل کا ہے۔ اخلاق و ادب کا ہے۔ گویا "کفو" کو ذات برادری یا کسی خاص طبقے تک محدود سمجھنا درست نہ ہو گا، اس کا اصل مقصود معاشرتی سطح پر قربت ہے، نہ کہ نسبیت و عصبیت۔

اگر اسلام بھی ہندو ازم کی طرح ذات اور نسل پر مبنی ایک مذہب ہوتا تو جس طرح ہندو ازم میں برہمن کی شادی برہمن اور ویش اور کھشتری کی شادی صرف اس کی ذات ہی میں ہو سکتی ہے، ویسے ہی اسلام میں بھی ہوتا۔ لیکن اسلام نے ان تمام جاہلی روایات کو توڑ کر زیدؓ کی شادی ایک ہاشمی النسل صحابیہ حضورؐ کی خونی رشتے دار کے ساتھ کر کے ایک نئی معاشرتی روایت کا آغاز کیا۔

امت مسلمہ کے لیے قابل عمل نمونہ آباو اجداد کی روایات نہیں، قرآن و سنت کی تعلیمات ہیں۔ اس لیے ہمیں ہاشمی سید اور "غیر قوم" کے خود ساختہ تصورات سے جو بڑی حد تک برصغیر کی مقامی روایات کے زیر اثر ہم نے اختیار کر لیے ہیں، نکلنا ہو گا۔ جہاں تک فتویٰ کا تعلق ہے، ترجمان القرآن کی یہ روایت رہی ہے کہ ہم مسائل کی تفہیم کے لیے تو مسئلے پر گفتگو کرتے ہیں لیکن ہماری کوئی رائے فتویٰ کے طور پر پیش کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ البتہ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ایک ہاشمی اور غیر ہاشمی کا نکاح ایک فرد کے غیر سید ہونے کی بنا پر فسخ نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت زیدؓ کی مثال سے قرآن و حدیث نے خود واضح کر دیا ہے۔ ایک شادی شدہ خاتون کا اس کے میکے آنا جانا بھی ایسے کسی تصور سے متاثر نہیں ہوتا۔ ہمیں چاہیے کہ عائلی معاملات میں قرآن و حدیث کو اپنا رہنما بنائیں اور محض خاندانی روایات کی بنا پر کسی عمل کو اختیار نہ کریں۔ (ڈاکٹر انیس احمد)


معیار
ہر قیمت پر
نوّے سال سے رُوح افزا کا بلند معیار ہی
رُوح افزا کی مقبولیت کی اساس ہے
SHARBAT
ROOH AFZA
REGD
HAMDARD FRUIT PRODUCTS
HFP
MADE IN PAKISTAN
مدینۃ الحکمۃ
تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ
ہمدرد
راحتِ جاں رُوح افزا مشروبِ مشرق

کتاب نما

تفہیم الاحادیث (اول' دوم' سوم) سید ابوالاعلیٰ مودودی' مرتبہ: عبدالوکیل علوی۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی' منصورہ' لاہور۔ صفحات: اول ۴۶۴' دوم ۴۷۰' سوم ۴۴۱۔ قیمت: اول ۲۲۵ روپے' دوم ۲۲۵ روپے' سوم ۳۰۰ روپے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بلاشبہ نابغہ عصر تھے۔ مفکر' سکالر' عالم دین' صحافی' ادیب' سیاست دان اور قائد تحریک اسلامی۔ انھوں نے برعظیم پاک و ہند میں سیاست' دینی فکر اور نشات ثانیہ کی تحریکوں پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کے فکری اور علمی کارنامے کے اثرات' مشرق و مغرب کی اسلامی تحریکوں اور مجموعی طور پر مسلم معاشروں میں' ایک طرح کی اسلامی بیداری اور حیات نو کے احساس میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

تفہیم القرآن ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے مختلف دینی اور عمرانی موضوعات پر سیکڑوں مضامین اور بیسیوں کتابیں لکھیں۔ اس وسیع ذخیرۂ تصانیف میں مولانا نے جگہ جگہ مختلف احادیث کا ذکر کیا' حوالہ دیا یا بعض احادیث کو مکمل یا جزوی طور پر نقل کیا اور کہیں متن کے ساتھ یا بلامتن' صرف ترجمہ دینے پر اکتفا کیا۔ تفہیم الاحادیث کے فاضل مرتب جناب عبدالوکیل علوی نے مولانا مرحوم کی تمام تصانیف کو کھنگال کر ان کے ہاں مذکور جملہ احادیث جمع کیں' ان کے متن تلاش کیے' جہاں مولانا نے کسی حدیث کا صرف ایک جز استعمال کیا' علوی صاحب نے وہ پوری حدیث تلاش کر کے نقل کی اور پھر عربی متون کے ترجمے بھی دیے۔

جناب عبدالوکیل علوی' قبل ازیں مولانا مرحوم کی رہنمائی اور جناب نعیم صدیقی کی رفاقت میں سیرت سرور عالمؐ کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دے چکے ہیں' مگر تبصرہ نگار کے خیال میں زیرنظر کام کہیں زیادہ مشکل تھا' اور یہ انھیں تن تنہا انجام دینا پڑا۔

متون احادیث کی تلاش' ترتیب' تکمیل یا تصحیح اور ان کے ترجمے کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کام علوی صاحب نے یہ کیا کہ احادیث کی اسناد تلاش کیں۔ مولانا محترم نے تو صرف یہ لکھا کہ فلاں حدیث بخاری و مسلم میں ہے یا ابوداؤد و ترمذی میں ہے مگر بخاری و مسلم نے اس کو کس کتاب' کس فصل اور باب میں اور کس عنوان کے تحت' یا کتاب کے کس صفحے پر روایت کیا ہے' یہ سب تحقیق' فاضل مرتب نے کی ہے اور

احادیث کے بارے میں محدثین کی آرا بھی دی ہیں کہ کون سی حدیث صحیح ہے، حسن ہے یا ضعیف ہے، وغیرہ۔ اگر کوئی حدیث ایک سے زائد کتابوں میں ملتی ہے مگر اس میں لفظی اختلاف ہے تو اسے بھی واضح کیا ہے اور ماخذ کا بھی حوالہ دیا ہے۔ تخریج احادیث کا یہ کام بڑا کٹھن تھا جسے فاضل مرتب نے کمال محنت و جاں کاہی اور عرق ریزی سے انجام دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک غیر معمولی لگن کے بغیر اسے انجام دینا ممکن بھی نہ تھا۔ اس وادی پرخار میں انھیں جو گوناگوں مشکلات پیش آئیں، ان کا تصور کرنا قارئین کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ ان کی برس ہا برس کی خاموش ان تھک پتہ ماری کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ تفہیم الاحادیث عبدالوکیل علوی صاحب کا بہت بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔

صرف تخریج کا کام ہی کتنا مشکل تھا، اس کا اندازہ "عرض مرتب" کے اقتباس ذیل سے ہو گا:

"تخریج احادیث کے مراحل کی دشوار گزار راہوں اور گھاٹیوں سے گزرتے وقت بہت سے مقامات ایسے بھی آئے جن کے نشان راہ کا معلوم کرنا، نہایت مشکل بن گیا یعنی کچھ احادیث ایسی سامنے آئیں جو اگرچہ زبان زد عوام تو ہیں مگر تلاش بسیار کے بعد بھی مدت تک ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ یہ مرحلہ بھی بڑا اعصاب شکن اور پریشان کن تھا۔ خدا خدا کر کے کچھ دیر بعد ان کا اتا پتا اور سراغ تو ملا مگر ادھورا اور ناکمل۔ ادھورا اور ناکمل اس معنی میں کہ کسی روایت کا متن تو مل گیا مگر سند کے بغیر، مثلاً "قریش قادۃ الناس"۔ مولانا محترم نے جس کتاب کا حوالہ دیا ہے، اس میں یہ بار بار تلاش کے باوجود نہ ملی۔ آخرکار معلوم ہوا کہ یہ تو فتح الباری شرح صحیح بخاری سے لی گئی ہے۔ وہاں اس حدیث کا متن تو ہے مگر سند حدیث نہیں۔ اسی طرح ایک بڑی مشہور حدیث "لا رھبانیۃ فی الاسلام" ہے، جو حدیث کی کسی معتبر کتاب میں نہیں ملی۔ آخر ملی تو تفسیر کی مشہور کتاب روح المعانی میں اور وہ بھی بغیر سند کے ملی۔ اس طرح ایک اور بہت مشہور حدیث "لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق" ہے جو انتہائی ورق گردانی کے بعد مجمع الزوائد کی پانچویں جلد میں بحوالہ طبرانی بغیر سند کے ملی۔ علی ھذا القیاس" (ص ۱۵)۔

لیکن یہ کام فقط تخریج مواد تک ہی محدود نہ تھا۔ نقل متون، اعراب و توقیف نگاری، اضافہ شدہ عربی عبارات کا ترجمہ، پھر اس سارے مواد کی ترتیب، عنوان بندی اور ابواب و فصول میں اس کی تقسیم، غرض یہ ایک نہایت صبر آزما پہاڑ کام تھا جس میں بقول مرتب: "بجا طور پر بار بار دامن ہمت تار تار ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا تھا، مگر ایسے مواقع پر فضل ایزدی ڈھارس بندھاتا رہا"۔ بلاشبہ مرتب نے اس کام کو نہایت ذمہ داری اور غیر معمولی استقلال کے ساتھ انجام دیا ہے۔ اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں اور اس محنت کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

جلد اول، صرف ایک باب "توحید" پر محیط ہے جس کے ذیل میں توحید کے تقاضے، اساسیات اسلام، چند مخصوص صفات باری تعالیٰ، خالق اور مخلوق، الاسماء الحسنیٰ، شرک اور اس کے نتائج و اثرات، مسئلہ تقدیر، ذات باری تعالیٰ کی نوعیت اور آخرت میں رویت باری تعالیٰ کے مباحث پر احادیث شامل ہیں۔ دوسری جلد میں "رسالت" کے ذیل میں وحی، محبت نبی، آلام و مصائب کا مکی دور، رسالت مآب کے اخلاق و شمائل، ختم نبوت، نزول عیسیٰ، خلافت اور اہل بیت۔۔۔ اور "آخرت" کے ذیل میں قیامت کی نشانیوں، حیات برزخ، میدان حشر اور جنت اور ان کے متعلقات پر احادیث یکجا کی گئی ہیں۔ جلد سوم کا موضوع کتاب الصلوٰۃ اور اس کے متعلقات ہیں: (وضو، غسل، اذان، امامت، اوقات نماز، تحویل قبلہ، نماز قصر، صلوٰۃ و خوف، رفع یدین، آمین بالجہر، درود، نماز جمعہ، نماز تہجد)۔

تفہیم الاحادیث" کی ایک اہمیت بلکہ شاید اصل حیثیت یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر آپؐ کے فرامین کا یہ ایک ایسا عمدہ مجموعہ ہے جو تحقیق اور کدوکاوش کے بعد مرتب کیا گیا ہے اور ہر حدیث کے ساتھ اس کی صحت و سند کے متعلق وضاحت موجود ہے۔ استفادہ و راہنمائی کے لیے یہ ایک مفید اور دلچسپ مجموعہ ہے۔ تصانیف مودودی کے حوالوں میں کتاب کے ایڈیشن یا سال طباعت کی صراحت بھی کر دی جاتی تو بہتر تھا کیونکہ کتابت کی تبدیلی کے ساتھ صفحات کم و بیش ہوتے رہے ہیں، اور آیندہ بھی ہوں گے۔

ادارہ معارف اسلامی نے تینوں جلدیں اہتمام سے شائع کی ہیں۔ معنوی اعتبار سے اس قدر اہم مجموعوں (خصوصاً اول و دوم) کی کتابت کا معیار بھی، کاش ان کے شایان شان ہوتا۔ (رفیع الدین ہاشمی)

شان صحابہؓ، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترتیب و تدوین: مولانا عبدالرحیم چترالی مرحوم۔ ناشر: مکتبہ حدیقۃ العلوم، المرکز الاسلامی، جی ٹی روڈ، اسلام آباد۔ صفحات: ۲۱۹۔ قیمت: درج نہیں۔

مولانا مودودیؒ نے ایک جگہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے:

"مدینہ کے پاک ماحول میں پوری جماعت کو اسلامی زندگی کی ایسی تربیت دی گئی کہ اس جماعت کا ہر فرد ایک چلتا پھرتا اسلام بن گیا جسے دیکھ لینا ہی یہ معلوم کر لینے کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور کس لیے آیا ہے؟ ان پر اللہ کا رنگ اتنا گہرا چڑھایا گیا کہ وہ جدھر جائیں، دوسروں کے رنگ قبول کرنے کے بجائے اپنا رنگ دوسروں پر چڑھا دیں۔ ان کے کریکٹروں میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی کہ وہ کسی سے مغلوب نہ ہوں اور جو ان کے مقابلے میں آئے، ان سے مغلوب ہو کر رہ جائے"۔

اس اجمال کی تفصیل مولانا محترم کی شہرہ آفاق تفہیم القرآن اور ان کی بیسیوں دیگر کتابوں میں جگہ جگہ ملتی ہے جن میں آپ نے صحابہ کرامؓ کے مقام و مرتبے، فضائل و مناقب، کمالات و خدمات اور سیرت و

کردار کو اپنے مخصوص دل نشیں اسلوب میں پیش کیا ہے۔

مولانا عبدالرحیم چترالی ایک تبحر عالم تھے اور ہزاروں لوگوں نے ان سے علمی فیضان حاصل کیا۔ بہت سے افغان رہنما اور مجاہدین بہ شمول گلبدین حکمت یار، احمد شاہ مسعود اور یونس خالص ان کے دروس میں شامل ہوتے رہے۔ مولانا چترالی اپنی تقاریر اور دروس میں مولانا مودودیؒ کی تحریروں کے ذریعے سامعین اور طلبہ کے دلوں کو صحابہ کرامؓ کے بارے میں جذبات عقیدت سے برابر سرشار کرتے رہتے تھے۔ زیر نظر کتاب تفہیم القرآن اور سیرت سرور عالمؐ سے اخذ کردہ تحریروں اور اقتباسات پر مشتمل ہے جنھیں موضوعات وار منتخب کیا گیا ہے۔ مولانا عبدالمالک نے اپنے فاضلانہ مقدمے میں مولف مرحوم کی کاوش کو سراہتے ہوئے اسے تین زاویوں سے اہم قرار دیا ہے کہ اس سے، اول: صحابہ کرامؓ کا مقام و مرتبہ اجاگر ہو گا۔ دوم: اقامت دین کے لیے جذبہ جہاد کو فروغ ملے گا اور سوم: یہ کہ اسلامی تحریک ان تحریروں سے ولولہ تازہ حاصل کرے گی۔

اشاعت کا اہتمام ڈاکٹر مظفر احمد نے اطمینان بخش اعلیٰ معیار پر کیا ہے اور وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ (د۔ ہ)

Muslims & Arab Perspectives، [مجلّہ : مسلم اور عرب تناظرات]۔ مدیر: ظفرالاسلام خان۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ عریبک سٹڈیز، پوسٹ بکس ۱۰۷۹۰، ڈی ۸۴، ابوالفضل ان کلیو I، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔ صفحات: ۲۴۸۔ قیمت: ۹۰ روپے/ ۱۵ ڈالر۔

اکتوبر ۱۹۹۳ سے شائع ہونے والے اس مجلّے نے فلسطین، بھارتی مسلمان اور بھارت میں یکساں سول کوڈ کے حوالے سے خصوصی نمبر شائع کیے ہیں۔ مغرب کی جانب سے علمی اور فکری یلغار کا لامحدود سلسلہ جاری ہے۔ مسیحی انجمنیں مسلم ممالک میں عیسائیت کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ چنانچہ افریقہ اور ترقی پذیر مسلم ممالک میں مسیحیت تیزی کے ساتھ اپنا جال پھیلا رہی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اس کا سدباب تو درکنار اس کے دور رس اور بھیانک نتائج کا احساس تک نہیں ہے۔ اس مجلّے کا موضوع زیادہ تر یہی مسئلہ ہے۔

پاکستان میں اقلیتیں، سیکھالیہ مسلمانوں کی حالت زار، بحرین اور قطر میں سیاسی اشتراک نیز مدیر مجلّہ اور ریڈسی مشن مسیحی مبلغ انجمن کے درمیان ہونے والی خط کتابت، اس شمارے کے اہم مضامین ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ مسیحیوں کا طرز تبلیغ کیا ہے اور رفاہ عامہ، صحت اور تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کو کس طرح تبدیلی مذہب پر مجبور کیا جاتا ہے۔

انڈونیشیا میں بھی مسیحی مبلغین سرگرم عمل ہیں۔ وہاں مسیحیت کے فروغ میں ریڈیو، کیسٹ اور ملازمتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کے اندر فروغ مسیحیت پر ایک مفید کتابیات (مرتبہ: ظفرالاسلام

خاں) بھی شامل ہے۔ پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں کے حوالے سے مقبول احمد بھٹی کا خصوصی مضمون بھی شامل ہے۔

رسالے میں کئی اور اہم موضوعات پر بھی مضامین ملتے ہیں لیکن ان مضامین کا اختصار گراں گزرتا ہے۔ کئی مضامین کے موضوعات تفصیل طلب تھے۔ آخر میں نئی کتابوں پر معلومات افزا تبصرے بھی شامل ہیں۔ امید ہے یہ رسالہ اپنی خصوصی اشاعتوں سے اہل علم کی پیاس بجھاتا رہے گا۔ (محمد ایوب منیر)

پاکستان کا نظریاتی بحران اور اقبال' مرتب: ثاقب اکبر۔ ناشر: اخوت اکلوی' پوسٹ بکس ۱۳۰۷' اسلام آباد۔ صفحات: ۸۵+۱۴۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔

بلاشبہ وطن عزیز ایک شدید بحران میں جتلا ہے۔ یہ بحران نظریاتی و اخلاقی بھی ہے اور معاشی و انتظامی بھی۔ اہل درد کو اس کا بخوبی احساس ہے اور اس پر شدید تشویش بھی۔ اسی ضمن میں اخوت اکلوی نے' اسلام آباد میں "پاکستان کا نظریاتی بحران اور اقبال" کے موضوع پر ایک سیمی نار منعقد کیا' عنوان تھا: "پاکستان کا نظریاتی بحران اور اقبال"۔ زیر نظر کتابچہ اسی مذاکرے کے مقالات پر مشتمل ہے۔ اقبال کے نظریہ ثقافت' نظریہ اجتہاد اور تصور قومیت کے حوالے سے قاضی حسین احمد' ڈاکٹر رحیم بخش شاہین' ثاقب اکبر' پروفیسر شاہد کامران اور جاوید حسین نے اپنی اپنی دانست میں مسئلے کا حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قاضی صاحب نے زیادہ تر "اسرار و رموز" کے حوالے سے اقبال کی اسلامی قومیت کا تصور اجاگر کیا ہے' جو ان کے خیال میں دراصل قرآن کریم سے ہی اخذ کیا گیا ہے لہٰذا مسئلے کا حل قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے ہی میں مضمر ہے۔ باقی مقالات نسبتاً علمی (Academic) نوعیت کے ہیں مگر یہ بات ان سے بھی واضح ہے کہ ہمارا تہذیبی اور ثقافتی سرچشمہ قرآن حکیم ہی ہے اور اسی کی روشنی میں موجودہ بحران سے عہدہ برآ ہونا ممکن ہے۔ (د-ه)

مطبوعات موصولہ

☆ **اورینٹل کالج میگزین ۱۹۹۷**' مدیر: ڈاکٹر ظہور احمد اظہر۔ ناشر: پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج' لاہور۔ صفحات: ۳۲۴۔ قیمت: ۶۰ روپے۔ [خصوصی اشاعت: اورینٹل کالج کے موجودہ اساتذہ کے کوائف و مطبوعات کی تفصیل--- ۲۸' اساتذہ کی تصانیف' مقالات اور ان کے زیرنگرانی ایم اے' ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات کی فہرست--- اس خاص نمبر کو کالج ہی کے ایک استاد ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے مرتب کیا ہے]۔

☆ **الترغیب والترہیب** جلد اول' حافظ زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری۔ ترجمہ: مولانا محمد عثمان۔ ناشر: زم زم پبلشرز' نزد مقدس مسجد' اردو بازار' کراچی۔ صفحات: ۳۶۵۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ [ساتویں صدی ہجری کے حافظ المنذری کی تصنیف کا خلاصہ اور ترجمہ و شرح' کتاب العلم' کتاب الطہارہ' علم کے فضائل' طہارت اور نماز کے آداب و مسائل پر احادیث و روایات کا عربی متن مع اعراب اور ترجمہ و تشریح' اشاعت کا عمدہ معیار]۔



اللہ کے فضل و کرم سے
ثناء اللہ نے جو چیز بنائی بہترین بنائی
ثناء اللہ
پاکستان میں اُونی اور ایکریلک مصنوعات کا
معیار قائم کرنے والے
ثناء اللہ وولن ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
ABC
Cashmira
BLANKETS
ABC
KNITTING
YARNS
PlushMink
BED
COVERS
AND
BLANKETS
SANAULLA
CARPET
YARNS
SANAULLA
WEAVING
YARNS
تیسری منزل، پینوراما سینٹر، فاطمہ جناح روڈ، کراچی۔ پاکستان۔
Phones: 516034 & 516035. Fax: 92-21-5681775.
Telex: 21699 SANA PK.

مدیر کے نام

محمد اسلم سلیمی، لاہور

اشارات بہت وقیع، مفید اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ماہ اپریل کے پرچے میں تعمیر بیت اللہ کی مناسبت سے "اسوۂ ابراہیمی اور ملت اسلامیہ کا حال زار" کے عنوان سے اشارات پڑھ کر مولانا مودودیؒ کے لکھے ہوئے اشارات کا لطف آیا۔ وہی رنگ، وہی رہنمائی کا سامان، لمحہ فکریہ، دعوت فکر و عمل! دل کی گہرائیوں سے پروفیسر خورشید احمد صاحب کی صحت، عمر اور علم میں اضافے کی دعائیں نکلیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ! دلی خواہش ہے کہ "ترجمان القرآن" پھر مولانا مودودیؒ کے زمانے والا پرچہ بن جائے۔ آمین! اس شمارے میں درج ذیل غلطیاں محسوس ہوئیں: ۱۔ صفحہ ۴ پر سطر نمبر ۳ میں ارشاد نبویؐ کا پہلا لفظ "حاسبوا" ہے، تحاسبوا نہیں۔ ۲۔ صفحہ ۸ پر سطر نمبر ۱ میں فارسی شعر میں "فرق" غلط محسوس ہوتا ہے۔ میرے ناقص علم کے مطابق "فلک" ہونا چاہیے۔ ۳۔ صفحہ ۸ پر سطر نمبر ۱۹ میں "فرعون" کے بجائے "نمرود" ہونا چاہیے۔ فرعون تو موسیٰؑ کے زمانے کا طاغوت تھا۔ ۴۔ صفحہ ۹ پر سطر نمبر ۶ میں تلبیہ کا دوسرا "و" لک سے پہلے نہیں بعد میں ہونا چاہیے۔ "لک والملک" صحیح ہے۔ ۵۔ صفحہ ۱۴ پر سطر نمبر ۱ میں حدیث کا آخری حرف "رعیۃ" کے بجائے "رعیتہٖ" ہونا چاہیے۔

☆ ترجمان: اغلاط پر توجہ دلانے کا بے حد شکریہ! آیندہ بہتر کرنے کی کوشش ہے۔

حامد عبدالرحمٰن الکاف، یمن

مولانا امین احسن اصلاحیؒ پر آپ کے مضمون میں کچھ غلو محسوس ہوتا ہے۔ مولانا مرحوم اپنے استاد مولانا فراہی کی ذات پر بہت زیادہ اعتماد کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ انھوں نے تدبر قرآن کو اپنے مقدمے میں اپنے "استاد کا صدقہ" قرار دیا ہے۔ میں نے بچشم خود مدرسۃ الاصلاح کی لائبریری میں مولانا فراہی کے قلم سے مسلم شریف پر لکھی ہوئی عربی زبان میں عبارت پڑھی ہے جو بہت ہی مختصر ہے اور ایسی نہیں کہ احادیث رجم کو بے وزن کرسکے۔

ممتاز علی شاہ، اٹک

عموماً مسلمانوں کے مسائل اس وقت خبروں کا موضوع بنتے ہیں جب وہاں کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو، جنگ چھڑ جائے یا بہت زیادہ ظلم ہونے لگے۔ آپ سے توقع ہوتی ہے کہ موضوع گرم نہ ہو تب بھی آپ ہمیں معلومات فراہم کریں مثلاً اشکیریا (چیچنیا) کے بارے میں عرصے سے کچھ نہیں لکھا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال چھیڑا جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال چھیڑنے کی بدولت وہ چیز حرام ٹھیرائی گئی۔

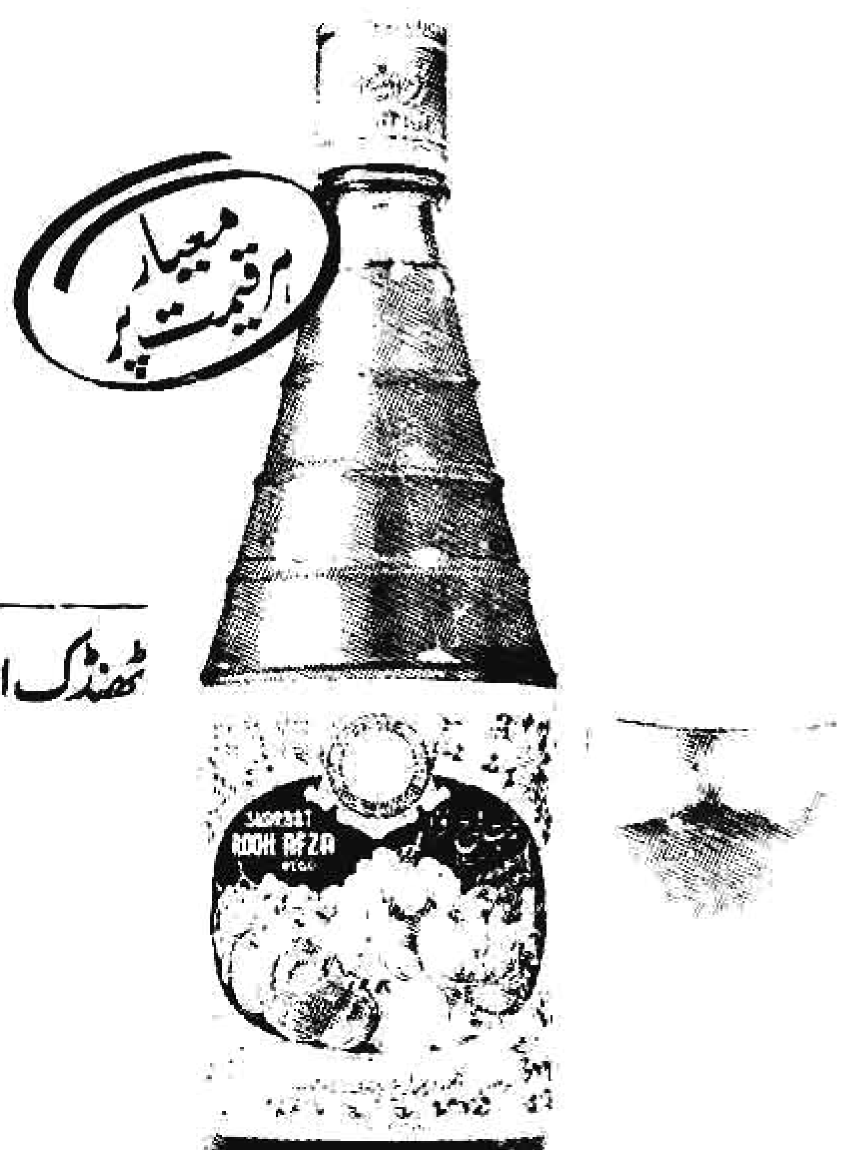
حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

یہ جاننے کے لیے کہ
پچھلے نوّے سال سے زائد عرصے سے رُوح افزا
کروڑوں شائقین کا پسندیدہ مشروب کیوں ہے،
آپ کو کسی تردّد کی ضرورت نہیں :

صرف

رُوح افزا

کا ایک گلاس نوشِ جاں کیجیے۔



ٹھنڈک اور فرحت لیے تازگی بھرا ذائقہ

ہمدرد

مدینۃ الحکمۃ تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ۔
آپ ہمدرد دوست ہیں۔ اعتماد کے ساتھ مصنوعاتِ ہمدرد خریدتے ہیں۔ جائز منافع بین الاقوامی
شہرِ علم و حکمت کی تعمیر میں لگ رہا ہے۔ اس کی تعمیر میں آپ بھی شریک ہیں۔

Adarts-HRA-8/97

C.P.L. 236

Phone : 7587916
7585590

Monthly **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE.